غرور ہستی

رزاق شاہد کوہلر

ناولٹ

رزاق شاہد کوہلر

غرورِ ہستی

بیس کنال کے رقبے پر پھیلی ہوئی وہ ایک محل نما کوٹھی تھی۔ اُس میں چار بڑے دروازے تھے۔ ہر دروازے پر تین تین باوردی گارڈز تعینات تھے۔ جو ہمہ وقت جدید اسلحے سے لیس رہتے تھے۔ اس کوٹھی کا مالک ارجمند سلطان تھا۔ جو نا صرف ملک کا مشہور و معروف بزنس مین تھا بلکہ کئی بار صوبائی الیکشن جیت کر ایم پی اے بھی رہ چکا تھا۔ وہ نہایت ہی متکبر اور ظالم انسان تھا۔ اُس کا شمار ملک کے امیر ترین اشخاص میں ہوتا تھا۔ اس کوٹھی جیسی اُس کی اور بھی بہت سی کوٹھیاں تھیں۔ جو ملک کے بڑے بڑے شہروں میں واقع تھیں۔ اسی طرح اُس کا بزنس بھی پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ تقریباً ہر بڑے شہر میں اُس کی کوئی نہ کوئی فیکٹری موجود تھی۔ نام تو اُس کا ارجمند سلطان غوری تھا۔ لیکن وہ سلطان ارجمند غوری کہلانا پسند کرتا تھا۔ اُس کی بیوی اور اکلوتے بیٹے تک کو یہ اجازت نہیں تھی۔ کہ وہ اُسے ارجمند سلطان غوری کہہ سکتے۔ ارجمند غوری سے پہلے لفظ ''سلطان'' سننا اُس کی کمزوری تھی۔ اُس کے سبھی جاننے والے اُسے سلطان ارجمند غوری ہی کہتے تھے۔ تاہم صرف ''سلطان غوری'' کہلوانے پر بھی وہ معترض نہیں ہوتا تھا۔ بس غوری سے پہلے لفظ ''سلطان'' لگانا ضروری تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ خود کو ماضی کے کسی سلطان کے جیسا سمجھتا تھا۔ یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ واقعی غوری ہے یا پھر دولت کے بل

بوتے پر غوری بنا پھرتا ہے؟ اُس کے خوف اور دہشت کی وجہ سے کوئی بھی اس معاملے میں پڑنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

ارجمند غوری کی عادت تھی کہ وہ صبح ناشتے کی ٹیبل پر نئے دن کے اخبارات ضرور پڑھتا تھا۔ناشتا وہ ہمیشہ اکیلے کرتا تھا۔بیگم اور بیٹا اسفند غوری اُس سے پہلے ہی ناشتا کرلیا کرتے تھے۔اُس روز ناشتا کرنے کے دوران اُس کی نظر ایک معروف اخبار کی سُرخی پر پڑی تو وہ سرتاپا سلگ اُٹھا۔اُسے یوں لگا جیسے کسی نے سرِ بازار اُسے ننگا کردیا ہو۔سُرخی پڑھنے کے بعد اُس نے خبر کی تفصیل پڑھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔سُرخی تھی۔''معروف سیاست دان ارجمند غوری کی نئی سیاسی پارٹی کے رہنما سے خفیہ ملاقات''ایڈیٹر بچارا نادانستگی میں ایک زہریلے ناگ کی دُم پر پاؤں رکھ بیٹھا تھا۔اخبار پھینک کر اُس نے فوراً جیب سے سیل فون نکالا،ایک نمبر ملایا اور پھر رابطہ ہوتے ہی سرد لہجے میں بولا۔''فیروز خان!تم کہاں ہو اس وقت؟''

''حکم کیجیے جناب!اس وقت گھر پہ ہی ہوں۔''فیروز خان کی مؤدب آواز سنائی دی۔

''فوراً ہماری کوٹھی پر پہنچو۔''اُس نے حکم سنایا۔

''جو حکم جناب۔''فیروز خان نے غلامانہ لہجے میں جواب دیا۔

ارجمند غوری نے کال منقطع کردی اور کرسی سے اُٹھ کر بے چینی کے عالم میں ٹہلنے لگا۔اُسے خفیہ ملاقات کے افشا ہوجانے پر بے حد غصہ تھا اور یہ سب کچھ اُس ایڈیٹر کی وجہ سے ہوا تھا جس نے یہ خبر لگائی تھی۔اس ملاقات کو مخفی رکھنے کا اُس نے پورا اہتمام کیا تھا۔مگر یہ میڈیا والے کسی نہ کسی طرح خبر حاصل کر ہی لیتے تھے۔یہ ایسی غلطی نہیں تھی کہ ارجمند غوری اُسے معاف کردیتا۔وہ فیروز خان کے پہنچنے تک بدستور غصے اور بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہا۔جب فیروز خان پہنچ گیا تو وہ قدرے پُرسکون ہوگیا اور دوبارہ بیٹھ گیا۔

''حکم کیجیے جناب۔''فیروز خان نے اندر داخل ہوتے ہی سر جھکا کر کہا۔

'' اِدھر آ کر یہ سُرخی پڑھو۔'' ارجمند غوری نے تحکمانہ انداز میں کہا۔'' اور پتا کرو کہ کون ہے اس اخبار کا ایڈیٹر؟ ہمیں وہ شام سے پہلے پہلے ہمارے فارم ہاؤس پہ چاہیے۔''

''جو حکم سر۔''فیروز خان نے سر جھکا کر جواب دیا اور پھر اُس سُرخی کی طرف متوجہ ہوگیا۔جس کی نشاندہی

ارجمند غوری نے کی تھی۔

''جناب! اس اخبار کا چیف ایڈیٹر..................''

''اُسے ہم جانتے ہیں۔'' ارجمند غوری نے قطع کلامی کی۔''چیف ایڈیٹر صرف نام کا ہوتا ہے۔ سارا کام ایڈیٹر کرتا ہے۔ ایڈیٹر کو اُٹھاؤ اور ہمارے فارم ہاؤس پہ پہنچا دو۔''

''پہنچا دیا جائے گا سر۔'' اُس نے فرماں برداری سے جواب دیا اور اُلٹے قدموں باہر نکل گیا۔

فیروز خان کے باہر نکلتے ہی ارجمند غوری نے جیب سے سیل فون نکالا اور ایک نمبر ملا دیا۔

''اوہ......سلطان غوری صاحب!'' رابطہ قائم ہوتے ہی دوسری جانب سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔''یہ صبح صبح آپ کو ہماری یاد کیسے آ گئی بابا؟''

وہ بولا۔''جناب! آپ ہماری پارٹی کے لیڈر ہیں اور ہم جو کچھ آج کرنے والے ہیں اُس کے متعلق آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔''

''آپ آزاد ہیں سلطان غوری صاحب! جو دل چاہے کریں۔ آپ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔''

''معاملہ میڈیا پرسن کا ہے۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں آپ..................''

''اوہ ......تو سلطان غوری!'' پارٹی لیڈر نے قطع کلامی کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔''آپ بے فکر ہو جائیں۔ ہم سب سنبھال لیں گے۔ آپ سے بس اتنی گزارش ہے کہ کوئی بھی غیر قانونی قدم اُٹھاتے وقت ثبوت نہ چھوڑا کریں۔''

''ڈونٹ وری جناب! عمر گزری ہے اس دشت کی سیاحی میں۔'' ارجمند غوری نے جوابی قہقہہ لگاتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔

☆......☆......☆

محمود غزنوی گزشتہ پندرہ سال سے پرنٹ میڈیا کے لیے کام کر رہا تھا۔ وہ لگ بھگ چھیالیس برس کا ایک صحت مند شخص تھا۔ پندرہ سال قبل اُس نے ایک معمولی رپورٹر کی حیثیت سے وہ معروف روزنامہ جوائن کیا تھا۔ جس کا آج وہ ایڈیٹر تھا۔ اُس کے آباؤ اجداد کا تعلق چونکہ غزنی سے تھا۔ اس لیے وہ اپنے نام کے ساتھ غزنوی

لکھتا تھا۔ کبھی کبھار وہ اخبار کے لیے کالم بھی لکھتا رہتا تھا۔ مگر اُس کا اصل کام ایڈیٹری تھا۔ اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے میں وہ نہایت ہی فرض شناس تھا۔ ادارے کا مالک اُس پر بے حد اعتماد کرتا تھا اور اُسے اُس کی خدمات کا قابلِ قدر معاوضہ ادا کرتا تھا۔ محمود غزنوی نے آج تک کبھی بھول کر بھی مالک کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی ۔ چنانچہ اُس بڑے شہر میں وہ نہایت ہی پُرسکون زندگی بسر کر رہا تھا۔ اُس کا ایک ہی بیٹا تھا مسعود غزنوی جو کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر کر رہا تھا۔

اُس روز وہ صبح دس بجے آفس پہنچا تو پیون نے اطلاع دی کہ ایک صاحب کافی دیر سے اُس کے منتظر ہیں۔ اُس نے جب ملاقاتی کے متعلق استفسار کیا تو پیون بولا۔ ”سر! اُس نے صرف اپنا نام بتایا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں بتایا۔“

”کیا نام ہے اُس کا؟“ غزنوی نے پوچھا۔

”انور حسین۔“

”کہاں ہے وہ؟“ غزنوی نے سوال کیا۔

”استقبالیے میں تشریف فرما ہے جناب۔“ پیون نے بتایا۔

”اوکے......اُسے اندر بھیج دو۔“ غزنوی نے سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”اور ہاں دو کپ اچھی سی چائے بھی بھجوا دینا۔“

پیون ”جی سر“ کہتے ہوئے غائب ہو گیا۔ جب کہ غزنوی ٹیبل پر پڑی ہوئی ایک فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ابھی اُس نے فائل کھول کر چند ہی کاغذات ملاحظہ کیے تھے کہ ایسے ہی وقت دروازے سے ایک نوجوان نمودار ہوا جس نے شلوار قمیص کے اوپر گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ گو کہ وہاں بہت کم سردی پڑتی تھی ۔ لیکن شاید اُس نوجوان کو زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ تبھی اُس نے گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ نوجوان نے اندر داخل ہو کر غزنوی کو سلام کیا اور پھر غزنوی کا اشارہ پا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

”فرمائیے انور صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ اُس کے بیٹھتے ہی غزنوی نے سوال کیا۔

نوجوان نے کہا۔ ”میں اخبار کے ایڈیٹر سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ کیا آپ کے علاوہ بھی یہاں کوئی ا

یڈیٹر ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ غزنوی نے قدرے چونک کر کہا۔’’ایڈیٹر صرف میں ہی ہوں۔لیکن آپ............‘‘

’’مطلب ہر قسم کی نیوز آپ ہی لگاتے ہیں۔‘‘ نوجوان نے قطع کلامی کی۔

’’ہاں میں ہی لگاتا ہوں۔لیکن آپ یہ سب تفتیش کیوں کر رہے ہیں؟‘‘ غزنوی نے قدرے جھنجلا کر پوچھا۔اُسے شاید نوجوان کی قطع کلامی بُری لگی تھی۔

’’بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ویسے یہ اندر کی باتیں آپ لوگ معلوم کیسے کر لیتے ہیں؟‘‘

’’ہمارے اپنے سورس ہوتے ہیں بھئی! آپ جان کر کیا کریں گے؟‘‘ اُس نے درشت انداز میں جواب دیا۔

نوجوان ایک جھٹکے کے ساتھ صوفے سے اُٹھا۔تیزی سے آگے بڑھا اور پھر چادر کے اندر سے ہی ریوالور کی نال غزنوی کے پہلو سے لگاتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔’’اُٹھو اور میرے ساتھ چلو،کوئی بھی غلط حرکت کی تو پہلو میں سوراخ کر دوں گا۔‘‘

’’کک........کون ہو تم اور یہ کیا بدتمیزی ہے؟‘‘ غزنوی نے خوف زدہ انداز میں پوچھا۔

’’تم چلتے ہو یا میں ٹریگر دبا دوں؟‘‘ نوجوان نے یوں مطمئن ہو کر کہا جیسے کسی چیونٹی کو مارنے کی بات کر رہا ہو۔

غزنوی چار و ناچار سیٹ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔نوجوان کا لہجہ بتا رہا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے۔اُس پر عمل کر گزرے گا۔

’’دروازے کی طرف بڑھو۔‘‘ نوجوان نے حکم دیا۔’’اور سنو کوئی بھی چالاکی تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔چہرے کے تاثرات درست کر لو دیکھنے والوں کو یوں لگے جیسے تم بخوشی میرے ساتھ جا رہے ہو۔‘‘

’’تت........تم........اچھا........‘‘

’’خاموش رہو۔‘‘ نوجوان نے سرد لہجے میں اُسے دھمکی تو وہ بات ادھوری چھوڑ کر دروازے کی طرف چل دیا۔راستے میں آفس کے چند ایک لوگوں نے قریب سے گزرتے ہوئے غزنوی کو سلام بھی کیا۔مگر اُن میں سے کسی کو بھی یہ خبر نہ ہو سکی کہ غزنوی کو گن پوائنٹ پر اغوا کر کے لے جایا جا رہا ہے۔پیون راہداری میں چائے لے

کرا رہا تھا۔ اُس نے غزنوی کو قدرے تعجب سے دیکھا لیکن وہ بھی کوئی سوال کیے بغیر نزدیک سے گزر گیا۔نوجوان بڑی آسانی کے ساتھ اُسے عمارت سے باہر لے آیا۔مین گیٹ کے قریب ہی ایک گاڑی موجود تھی۔نوجوان نے گاڑی کی عقبی کھڑکی کھول کر غزنوی کو اندر دھکیلا اور پھر خود بھی اُس کے ساتھ جُڑ کر بیٹھ گیا۔گاڑی کی کھڑکیوں کے شیشے ڈارک تھے۔باہر سے کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔چنانچہ نوجوان نے غزنوی کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی تھی۔اُن کے بیٹھتے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گیئر لگاتے ہوئے آگے بڑھا دی۔گاڑی تقریباً ڈیڑھ گھنٹا چلتی رہی۔اس کے بعد ایک بڑے سے فارم ہاؤس میں جا کر رک گئی۔دورانِ سفر اُن کے درمیان خاموشی ہی رہی تھی۔

غزنوی کو گاڑی سے اُتار کر اُنہوں نے ایک کمرے میں بند کر دیا۔اور خود فارم ہاؤس کے لان میں جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ڈرائیور نے مسکرا کر نوجوان کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔''نادر خان! اس بچارے سے نادانستہ غلطی سرزد ہوئی ہے۔اب پتا نہیں ارجمند صاحب اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟''

نادر خان نے کہا۔''فیروز لالہ! ویسے یہ بہت مشکل کام تھا۔مگر تم نے چٹکیوں میں سرانجام دے دیا۔آج تو ارجمند صاحب تمھیں منہ مانگا انعام دیں گے۔''

فیروز خان مسکرایا۔''فکر مت کرو تجھے بھی کچھ نہ کچھ ضرور ملے گا۔''

''ہاں بس اُونٹ کے منہ میں زیرے والی بات ہوگی۔'' اُس نے منہ بنایا۔''تمھیں نوٹوں کی گڈی ملے گی اور مجھے چند ہزار روپے۔''

''خطرہ بھی تو میں نے مول لیا ہے نا! تم تو مزے سے گاڑی میں بیٹھے رہے۔''

وہ بولا۔''نوٹوں کی پوری گڈی نہ سہی، ایک تہائی گڈی تو میرا حق بنتا ہے۔میں نے بھی تمھارے ساتھ خطرہ مول لیا ہے؟''

''یہ گلہ تو تم ارجمند صاحب سے بھی کر سکتے ہو۔'' فیروز خان نے قہقہہ لگایا۔''یا تو مالا مال ہو جاؤ گے یا پھر بدحال۔''

''شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اُس کے دانت گننے والا احمق ہوتا ہے۔میں کیا تمھیں بے وقوف نظر

آتا ہوں؟''

''شکل سے تو اچھے خاصے ذہین لگتے ہو لیکن باتیں بعض اوقات بے وقوفوں سے بڑھ کر احمقانہ کرتے ہو۔''

وہ بُرا مان کر بولا۔''میں بے وقوف نہیں ہوں۔بس تجھے دوست سمجھ کر دل کی بات بتا دی۔مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم میرا مذاق اُڑاؤ گے ورنہ میں ایسی غلطی کبھی نہ کرتا؟''

''میں تو تمہاری ساتھ دل لگی کر رہا تھا یار۔''فیروز خان مسکرایا۔''تم تو سنجیدہ ہی ہو گئے۔''

''مجھے دراصل آج کل پیسوں کی اشد ضرورت ہے۔اگر تم مجھے کچھ رقم قرض کے طور پر دے دو تو میں تمہارا ممنون ہوں گا۔''نادر خان نے اپنی ضرورت بتائی۔

''او کے میں کچھ کرتا ہوں۔''فیروز خان نے اثبات میں سر ہلایا۔''ویسے کتنے پیسوں میں تمہارا کام چل جائے گا؟''

''کم سے کم ڈیڑھ لاکھ تو ہونا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے میں ارجمند صاحب سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔مجھے اُمید ہے کہ تمہارا کام ہو جائے گا۔'' فیروز خان نے اُسے اُمید دلائی۔

''فیروز لالہ! اگر ایسا ہو گیا تو میری بہت بڑی پریشانی دُور ہو جائے گی۔''

''فکر مت کرو ہو جائے گا۔''فیروز خان نے جواب دیا اور پھر ارجمند غوری کو کال کرنے لگا۔

رابطہ ہوتے ہی وہ پُرجوش انداز میں بولا۔''سر! کام ہو گیا ہے۔''

''ویلڈن فیروز خان! آج ہم تمہیں منہ مانگا انعام دیں گے۔''ارجمند غوری نے خوش ہو کر جواب دیا۔

فیروز خان نے کہا۔''سر! آپ اُس کا نام جان کر حیران رہ جائیں گے۔''

''وہ کیسے بھلا......کیا اُس کا نام بہت عجیب ہے؟''

''جناب! اُس کا نام محمود غزنوی ہے۔''

''اوہ........پھر تو لطف آ جائے گا کہ وہ بھی ہماری طرح ایک تاریخی نام کا حامل ہے۔''ارجمند غوری نے قہقہہ لگایا۔''او کے شام کے وقت اُسے دیکھ لیں گے۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے سر؟'' فیروز خان نے پوچھا۔

''تم وہیں فارم ہاؤس پہ رہو۔'' ارجمند غوری نے حکمیہ انداز میں کہا اور کال منقطع کر دی۔

☆......☆......☆

ٹھیک سورج غروب ہوتے ہی ارجمند غوری کی شاندار پراڈو فارم ہاؤس میں داخل ہوئی اور طویل کاریڈور کے عین سامنے پہنچ کر رُک گئی۔ ڈرائیور انجن بند کیے بغیر تیزی سے نیچے اُترا اور گاڑی کی عقبی کھڑکی کھولتے ہوئے ایک طرف ہو گیا۔ ارجمند غوری شاہانہ انداز میں گاڑی سے باہر نکلا تو اُس کی گردن غرور سے تنی ہوئی تھی اور چہرے پر رعونت طاری تھی۔ اُس نے ہاتھ میں ایک نیوز پیپر بھی پکڑ رکھا تھا۔ ایک ایک قدم تکبر کے ساتھ اُٹھاتے ہوئے وہ یوں آگے بڑھا جیسے کسی وسیع و عریض سلطنت کا سلطان ہو۔ ابھی اُس نے کاریڈور کے اندر پاؤں رکھا ہی تھا کہ فیروز خان دوڑتا ہوا پہنچ گیا۔

''سر! مجرم کونے والے کمرے میں ہے۔'' فیروز خان نے سر کو خم کرتے ہوئے مؤدب انداز میں بتایا۔

''اُسے کھانا وغیرہ تو کھلا دیا تھا نا؟'' اُس نے رعونت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''سر! میں نے بہت کوشش کی تھی۔ مگر وہ بہت ہی ڈھیٹ انسان ہے۔ اُس نے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا۔''

''اوکے۔'' اُس نے گردن ہلائی۔ ''اُسے ہمارے سامنے پیش کرو۔''

''جو حکم جناب۔'' فیروز خان نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا اور پھر کونے والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

ارجمند غوری بھی آگے بڑھ کر ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ کمرہ باہر سے جس قدر خوب صورت تھا۔ اندر سے اتنا ہی بھیانک تھا۔ دیواروں پر خُون کے جیسا سُرخ پینٹ کیا گیا تھا۔ کمرے کے عین وسط میں ایک جدید طرز کی آرا مشین پیوست تھی۔ جس پر بیلٹ نما تیز دھار آری چڑھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں دیوہیکل آہنی الماری ایستادہ تھی۔ الماری کے دائیں جانب دیوار سے قدرے ہٹ کر ماربل کا ٹیبل لگا ہوا تھا۔ جس کے عقب میں ایک آرام دہ اور کشادہ کرسی رکھی ہوئی تھی۔ غوری نے آگے بڑھ کر الماری کے دونوں پٹ کھول دیے۔ الماری کے اندر ایذا رسانی کے قدیم و جدید آلات بھرے ہوئے تھے۔ وہ چند لمحے الماری کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اُوپری خانے سے ایک سفید اور آل اور سرجری گلوز نکالنے کے بعد الماری بند کر دی۔ دونوں چیزیں ٹیبل

پر رکھنے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کی نگاہ کمرے کے دروازے پر جمی ہوئی تھی۔ ایسے ہی وقت فیروز خان، محمود غزنوی کو لے کر پہنچ گیا۔

''مجرم حاضر ہے جناب۔'' فیروز خان نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

ارجمند غوری نے حقارت بھرے انداز میں غزنوی کی طرف دیکھا اور پھر ٹیبل سے اخبار اُٹھا کر اُس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ''یہ خبر تم نے لگائی ہے نا؟''

''ہاں میں نے لگائی ہے۔'' اُس نے قدرے حیران ہو کر کہا۔ ''کیا یہ خبر جھوٹی ہے؟''

''اوں ہوں۔'' وہ تحقیر آمیز انداز میں مسکرایا۔ ''خبر سو فی صد درست ہے۔ بس تمہیں لگانے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

''کیوں خبر لگانا کوئی جرم ہے؟''

غوری نے کہا۔ ''تمہیں ہم سے پوچھ کر یہ خبر لگانا چاہیے تھی۔''

''وہ کس لیے؟''

''وہ اس لیے کہ ہمیں اپنی تشہیر سخت ناپسند ہے۔ اب تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تمہیں اس خبر کی تردیدی خبر لگانا پڑے گی۔''

''یہ ناممکن ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا اور نہ کبھی بولوں گا۔''

''اس کا مطلب ہے تمہیں اپنی زندگی سے ذرا بھی پیار نہیں ہے؟'' ارجمند غوری نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''زندگی اور موت کے فیصلے آسمانوں پہ ہوتے ہیں مسٹر غوری! آپ یہ دھمکی کسی اور کو دیں۔'' اُس نے بے خوف لہجے میں جواب دیا۔

''کبھی کبھی زمین پر بھی ہو جاتے ہیں یہ فیصلے۔''

''ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔''

''او کے اپنی قیمت بتاؤ؟'' ارجمند غوری نے کاروباری انداز میں پوچھا۔

''ایمان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی مسٹر غوری! میں ایمان فروش نہیں ہوں۔ میری ''ناں'' کو آپ ہاں میں نہیں بدل سکتے۔'' اُس نے ترت جواب دیا۔

ایسے ہی وقت فیروز خان کا ہاتھ گھوما اور غزنوی کا دایاں کان سائیں سائیں کرنے لگا۔ اُسے جملہ مکمل کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ فیروز خان کا ہاتھ کسی ہتھوڑے کے مانند وزنی تھا۔

''احمق انسان!'' فیروز خان چلایا۔ ''تمہیں کس گدھے نے ایڈیٹر بنایا ہے۔ اتنی سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی کہ صاحب کو ''ناں'' سننے کی عادت نہیں ہے۔ جانتے ہو کس کے سامنے انکار کر رہے؟ یہ سلطان غوری ہے۔ حکومت کے ایوانوں تک اس کی پہنچ ہے۔''

غزنوی اپنی یہ تذلیل برداشت نہ کر سکا۔ چنانچہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''یہ کون سی سلطنت کا سلطان ہے؟ نام کے ساتھ غوری لکھنے سے کوئی سلطان نہیں بن جاتا۔''

فیروز خان نے کہا۔ ''تیرے جیسا دو ٹکے کا ایڈیٹر اپنے نام کے ساتھ غزنوی لکھ سکتا ہے تو پھر صاحب سلطان غوری کیوں نہیں بن سکتے؟''

''میرے آباؤ اجداد کا تعلق غزنی سے تھا۔ اس لیے میں اپنے نام کے ساتھ غزنوی لکھتا ہوں۔''

ارجمند غوری نے مداخلت کی۔ ''ہمیں لگتا ہے تم نے اپنے اجداد سے کچھ بھی نہیں سیکھا اور نہ ہی تاریخ پڑھی ہے ورنہ یوں کسی غوری کے سامنے سر اُٹھا کر بات کرنے کی جسارت بھول کر بھی نہ کرتے۔ تمہیں معلوم ہے بہرام شاہ غزنوی کے ساتھ علاؤ الدین غوری نے کیا سلوک کیا تھا؟''

''ہاں وہ بھی معلوم ہے۔'' غزنوی نے سر ہلایا۔ ''اور یہ بھی معلوم ہے کہ سیف الدین سوری جو کہ غوری تھا اُس کے ساتھ بہرام شاہ نے کیا سلوک کیا تھا؟ شاید آپ کو معلوم نہ ہو تو میں بتا دیتا ہوں۔ بہرام شاہ نے سیف الدین غوری کا منہ کالا کرنے کے بعد اُسے ایک کمزور گائے پہ بٹھا کر پورے غزنی شہر میں گھمایا تھا۔ غزنی کے بچوں نے اُس کا جلوس نکالا تھا۔ جب کہ بچیوں نے دف بجا کر اُس روز ا نجوائے کیا تھا۔''

ارجمند غوری کی اس قدر تذلیل کب ہوئی تھی۔ اُس نے ایک قہر آلود نگاہ غزنوی پر ڈالی۔ اور آل پہنا اور گلوز اُٹھاتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں خوشی ہوئی یہ سن کر کہ تمہیں اپنے اجداد کی تاریخ یاد ہے۔ مگر آج ہم جو

تاریخ رقم کرنے والے ہیں وہ تم مرتے دم تک نہیں بھولو گے۔“

غزنوی بولا۔”تم کیا کرلو گے......زیادہ سے زیادہ مجھے مارڈالو گے نا! تو مارڈالو۔“

ارجمند غوری تیزی کے ساتھ کرسی سے اُٹھا اور آہنی الماری سے ایک تیز دھار اُسترا نکال لیا۔

”فیروز خان اس کے دونوں بازو جکڑ لو۔“ اُس نے آگے بڑھتے ہوئے فیروز خان کو حکم دیا۔

فیروز خان نے ”جی سلطانِ معظم“ کہہ کر غزنوی کے دونوں بازو مروڑ کر اُس کی پشت سے لگا دیے اور پھر اُسے یوں جکڑ لیا کہ غزنوی ہلنے سے بھی قاصر ہو گیا۔

غوری نے سرجری گلوز پہنے، ہاتھ میں پکڑا ہوا اُسترا کھولا اور پھر دائیں ہاتھ سے غزنوی کا گلا دباتے ہوئے غرایا۔”بولو خبر کی تردید کرو گے کہ نہیں؟ ورنہ گلے پہ اُسترا پھیر دوں گا۔“

”پھ......پھ............پھیر............دو، میں.....ایک ظالم کے سامنے سر نہیں جھکاؤں گا۔“ غزنوی کے گلے سے بمشکل پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

”ہاں بول دو مجھے مجبور مت کرو، یہ نہ ہو کہ مجھے تمہاری زبان کاٹنی پڑ جائے؟“ ارجمند غوری نے اُسے دھمکی دی۔

”زبان کٹتی ہے تو کٹ جائے لیکن میں اپنے پیشے سے بددیانتی نہیں کروں گا۔“

غوری فیروز خان سے مخاطب ہوا۔”فیروز خان! یہ ایسے نہیں مانے گا۔ اس کے ہاتھ مضبوطی سے باندھ دو اور پھر اس کا گلا دباؤ، ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کیسے ہاں نہیں کہتا۔“

”جو حکم جناب۔“ فیروز خان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا اور پھر رسی لے کر غزنوی کے ہاتھ باندھنے لگا۔

”ارجمند غوری! خدا بننے کی کوشش مت کرو۔“ گلے سے ہاتھ ہٹتے ہی غزنوی چلایا۔”تم سے پہلے بھی اس زمین پر یہ مذموم حرکت کئی بار کی گئی ہے اور جنہوں نے یہ حماقت کی وہ اپنے وقت کے بڑے بڑے تاجدار تھے۔ لیکن ہوا کیا؟ حشر تک کے لیے نمونۂ عبرت بن کر رہ گئے۔“

غوری نے کہا۔”جتنا چاہے بول لو کہ اس کے بعد تمہاری بولتی ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گی۔“

وہ بولا۔”خدا نے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ پیدا کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُس نے تمہارے لیے بھی کوئی

موسیٰ ضرور پیدا کیا ہوگا۔ جو تجھے نیست و نابود کر دے گا۔"

"اُس موسیٰ کو بھی ہم دیکھ لیں گے۔" وہ پُر غرور لہجے میں بولا۔ "تم بس اپنی خیر مناؤ۔"

فیروز خان نے غزنوی کے ہاتھ باندھنے کے بعد اُسے زمین پر پٹخا اور اُس کے سینے پر سوار ہو کر دونوں ہاتھوں سے اُس کا گلا دبانے لگا۔ غزنوی نے بہت کوشش کی کہ اُس کی زبان باہر نہ نکلے۔ مگر کب تک؟ آخر کار اُس کی ہمت جواب دے گئی۔ اِدھر اُس کی زبان باہر نکلی تو اُدھر غوری کا اُسترا چلا۔ غزنوی کی زبان پلک جھپکنے کی دیر میں کٹ کر فرش پر جا گری۔ اُس کی ٹھوڑی اور گردن خون سے رنگین ہو گئی۔ مگر غوری کا غصہ پھر بھی ٹھنڈا نہ ہو سکا۔ غزنوی کو فرش پر تڑپتا ہوا چھوڑ کر وہ آرا مشین کی طرف بڑھا اور اُسے آن کر دیا۔

"فیروز خان! اس کے ہاتھ کھول کر اِدھر لے آؤ۔" اُس نے بے رحم انداز میں حکم سنایا۔

"جو حکم سلطانِ معظم۔" فیروز خان نے جواب دیا اور پھر غزنوی کے ہاتھ کھول کر اُسے گھسیٹتا ہوا آرا مشین تک لے گیا۔

غوری نے ایک جھٹکے سے اُس کا ہاتھ پکڑا برق رفتاری سے چلتی ہوئی آری کے سامنے لایا تو غزنوی کی جگر پاش چیخ سے ماحول تھرا اُٹھا۔ آری نے کلائی سے اُس کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ غزنوی بے تحاشا تڑپ رہا تھا۔ چیخ رہا تھا مگر غوری کے چہرے پر رحم کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اُس کا اوور آل اور گلوز غزنوی کے خون سے رنگین ہو چکے تھے۔ اُس کے چہرے پر درندگی چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں قہر ہی قہر تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے غزنوی کے دوسرے ہاتھ کے ساتھ بھی یہی حشر کیا۔ غزنوی اذیت کے کئی سمندر عبور کرنے کے بعد آخر کار ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گیا۔

غوری نے اوور آل اور گلوز اُتار کر پھینک دیے۔ اس کے بعد اُس نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور فیروز خان کو تھماتے ہوئے بولا۔ "یہ نوٹ اس کی جیب میں ڈالو اور اسے کسی ہاسپٹل کے سامنے پھینک دو۔ اب یہ عمر بھر نہ تو بول سکے گا اور نہ لکھ سکے گا۔"

"بہتر جناب۔" فیروز خان نے مؤدب انداز میں جواب دیا اور نوٹ لے کر غزنوی کی جیب میں ڈال دیے۔

☆......☆......☆

وہ موٹر بائیک ساحلِ سمندر کی طرف جانے والی کشادہ سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی تھی۔ بائیک کی ٹینکی پر ایک خوب صورت گورا چٹا بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ جس کی عمر لگ بھگ پانچ سال تھی۔ موٹر بائیک سے چند قدم دُور ایک مضبوط اور صحت مند شخص کھڑا ہوا تھا۔ جو بڑے اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ یہ رضوان تنولی تھا جو بیٹے کو ساحلِ سمندر کی طرف سیر کرانے کے لیے لے جا رہا تھا کہ اچانک اُسے ایک دوست کی طرف سے کال موصول ہوگئی۔ تب اُس نے موٹر بائیک روک کر کال سنی اور پھر سگریٹ سلگالی۔ یونہی کش لگاتے لگاتے وہ موٹر بائیک سے قدرے دُور نکل گیا۔ غالباً وہ کسی مسئلے میں اُلجھا ہوا تھا۔ اس لیے وقتی طور پر وہ بیٹے اور بائیک کو بھول گیا۔ دوست نے بات ہی ایسی کی تھی کہ وہ پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ سیر کا پروگرام ملتوی کر کے واپس لوٹ جائے لیکن ننھے عمران کی خواہش ٹالنا اُس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ عمران سے جنون کی حد تک پیار کرتا تھا۔ بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا عمران، سو رضوان کی جان اُس میں اٹکی رہتی تھی۔ وہ اُسے خود سے انتہائی مجبوری کے عالم میں کبھی کبھار ہی جُدا کیا کرتا تھا۔ ورنہ تو عمران ہمیشہ اُس کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔ رضوان کی ملازمت ہی ایسی تھی کہ وہ باآسانی بیٹے کو ساتھ رکھ سکتا تھا۔ وہ ایک میڈیسن کمپنی میں کام کرتا تھا۔ نئی ادویات کے سیمپل متعارف کرانا اور اسٹور مالکان سے آرڈر وصول کرنا اُس کی ذمہ داری تھی۔ یہ ذمہ داری نہایت ہی آسان تھی۔ چنانچہ دورانِ ڈیوٹی عمران اُس کے لیے کبھی مسئلہ نہیں بنا تھا۔ کمپنی اُسے اچھی خاصی ماہانہ سیلری ادا کرتی تھی۔ جس سے اُس کی گزر اوقات بڑے اچھے طریقے سے ہو جاتی تھی۔ لہٰذا وہ فکرِ معاش سے آزاد تھا۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ معاً اُسے خطرے کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے پلٹا مگر اُسے دیر ہو چکی تھی۔ وہ وقت سے تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ وہ ابھی بائیک سے چند قدم دُور ہی تھا کہ اچانک ساحلِ سمندر کی طرف سے آنے والی ایک تیز رفتار اسپورٹس کار پوری قوت سے موٹر بائیک سے ٹکرائی۔ ٹینکی پہ بیٹھا عمران فضا میں بلند ہوا اور پھر ایک دھماکے کے ساتھ سر کے بل پختہ سڑک سے ٹکرایا۔ ایک پل میں اُس معصوم بچے کی کھوپڑی پاش پاش ہوگئی۔ رضوان ہذیانی انداز میں چیختا ہوا عمران کی طرف بھاگا اور اُسے اُٹھا کر سینے سے لگالیا مگر وہ اب وہ بہت دُور جا چکا تھا۔ موت نے اُس معصوم کو چلانے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ رضوان نجانے کتنی ہی دیر بیٹے کو گود میں

لیے روتا رہا۔اس دوران کچھ لوگ وہاں اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے رضوان کو سنبھال لیا۔ایک نوجوان نے جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔"سب سے پہلے اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دینا چاہیے.......آپ نے گاڑی کا نمبر تو نوٹ کیا ہو گا؟"

"نہیں.......پولیس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔"میں خود اُس سے نمٹ لوں گا۔"

"آپ چاہیں تو میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ سکتا ہوں۔"نوجوان نے پُر خلوص آفر کی۔"ویسے بھی میں شہر کی طرف جا رہا ہوں۔"

"ہاں مجھے مدد کی ضرورت ہے۔"اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر سڑک کے کنارے گری ہوئی موٹر بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

بائیک کی ہیڈ لائیٹ اور اگلا پہیا مکمل طور پر ناکارہ ہو چکے تھے۔جب کہ عقبی جانب والا حصہ معمولی سی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا تھا۔وہ بائیک کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اچانک اُس کی نظر ایک نمبر پلیٹ پر پڑی۔اُس نے آگے بڑھ کر پلیٹ اُٹھا لی۔یہ ایک مضبوط دھاتی پلیٹ تھی۔جو ٹکر کے نتیجے میں ٹوٹنے سے محفوظ رہی تھی۔تاہم درمیان سے ٹیڑھی ضرور ہو گئی تھی۔لیکن نمبر با آسانی پڑھا جا سکتا تھا۔نوجوان نے بھی اُسے نمبر پلیٹ اُٹھاتے دیکھ لیا تھا۔وہ آگے بڑھا اور رضوان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔"یہ اُسی گاڑی کی نمبر پلیٹ ہے۔اب وہ کہیں نہیں چھپ سکتا۔اچھا ہوا کہ اتنا اہم ثبوت آپ کے ہاتھ لگ گیا ورنہ انسانوں کے اس جنگل میں اُسے ڈھونڈنا ممکن نہیں تھا۔"

وہ بولا۔"میرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے مسٹر..........."

"لوگ مجھے سِدّو کے نام سے جانتے ہیں۔"نوجوان نے قطع کلامی کی۔"آپ بھی مجھے سدو کہہ سکتے ہیں۔"

رضوان نے کہا۔"بہت شکریہ بس مجھے میرے گھر تک چھوڑ دیجیے۔بائیک میں بعد میں اُٹھوا لوں گا۔"

"مجھے خوشی ہو گی جناب۔"نوجوان نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر سڑک کے کنارے موجود ایک ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔

چند لمحوں کے بعد رضوان ٹیکسی کی عقبی سیٹ پر بیٹھا گھر کی طرف روانہ تھا۔مردہ عمران کو اُس نے بازوؤں

میں اُٹھا رکھا تھا۔ اُس کے چہرے پر کچھ ایسی کیفیت طاری تھی جسے کوئی بھی نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔

ٹیکسی میں چند لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر سدو پہل کرتے ہوئے بولا۔ ''گو کہ اس وقت آپ سے کچھ بھی پوچھنا نہایت ہی نامناسب حرکت ہوگی مگر کیا کروں کہ دنیاداری کا یہی تقاضہ ہے۔ یہ حادثہ ہوا کیسے........ غلطی کس کی تھی........ آپ کی یا اُس گاڑی والے کی؟''

رضوان تنولی چند لمحے چپ بیٹھا رہا، پھر سارا واقعہ اُس کے سامنے دوہرا دیا۔

سدو بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ساری غلطی اُس اسپورٹس کار والے امیرزادے کی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یہ امیرزادے ہم جیسے عام انسانوں کو انسان کیوں نہیں سمجھتے........ کیوں دولت اور طاقت کے نشے میں چُور ہوکر غریبوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہتے ہیں تو کبھی اُن کی عزت نفس کا جنازہ نکال دیتے ہیں؟''

''میں عام آدمی نہیں ہوں سِدو۔'' اُس کے لہجے سے عزم جھلک رہا تھا۔ ''وہ جو بھی تھا اب مجھ سے بچ نہیں پائے گا۔ پچھتائے گا کہ اُس کا واسطہ رضوان تنولی سے کیوں پڑ گیا؟''

سِدو نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ سڑک پر نظر رکھتے ہوئے بولا۔ ''دوست! اس شہر میں اسپورٹس کار رکھنے والا کوئی عام شخص نہیں ہوگا۔ یقیناً کسی سیاست دان یا بیوروکریٹ کی اولاد ہوگا۔ آپ اُن سے کیسے لڑوگے؟........ قانون تو یہاں ہمیشہ طاقت ور کا ساتھ دیتا ہے۔''

''قانون کے پاس کمزور جاتے ہیں سدو! اور میں کمزور نہیں ہوں۔ تم اگر دیکھنا چاہتے ہو کہ میں اُس کے ساتھ کیا سلوک کروں گا تو پھر چند دنوں کے بعد مجھ سے رابطہ کرنا۔''

''میں........ میں ضرور رابطہ کروں گا جناب۔'' وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ ''اور ایک امیرزادے کا عبرت ناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہوں گا۔ کیا آپ میری یہ خواہش پوری کردیں گے؟''

''ضرور کروں گا۔ بے فکر رہو میں تجھے ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

سِدو نے کہا۔ ''بہت بہت شکریہ جناب! کیا میں آپ کو بڑے بھیا کہہ سکتا ہوں؟''

''اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن تم نے اپنے متعلق تو کچھ بتایا ہی نہیں ہے؟ شکل وصورت اور بول چال سے تو تم مجھے نا صرف پڑھے لکھے لگتے ہو بلکہ کسی شریف اور اچھے خاندان کے بھی لگتے ہو مگر یہ ٹیکسی ڈرائیور........

مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی؟"

"میں نے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر کیا ہے۔ مگر جاب پھر بھی نہ مل سکی۔ سو ٹیکسی چلا کر رزق کما رہا ہوں۔"

"ماں باپ، بہن بھائی؟"

"اکلوتا ہوں۔ ماں باپ بوڑھے ہیں اور گھر میں رہتے ہیں۔ بلکہ باپ تو دائمی مریض ہے۔" سِدو نے دکھی ہو کر بتایا۔" کاش میرے بس میں ہوتا تو میں ابو کو علاج کے لیے امریکہ یا برطانیہ لے جاتا۔"

اسی دوران ٹیکسی رضوان کے گھر کے سامنے پہنچ گئی۔ اُنہوں نے آپس میں فون نمبرز کا تبادلہ کیا اور پھر رضوان نے جیب سے والٹ نکال لیا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے بھیا!" سِدو نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں یہ نہیں لے سکتا۔"

وہ بولا۔" یہ تمہاری محنت کی کمائی دوست! بھلے اس وقت میں غم کی جس کیفیت سے گزر رہا ہوں وہ ایسی باتوں.................."

"نہیں رضوان بھائی! آپ اصرار کریں گے تو مجھے دُکھ ہوگا۔ پلیز رہنے دیں۔" سِدو نے قطع کلامی کی۔

"بہت شکریہ دوست! ہم دوبارہ ملیں گے۔" رضوان نے جواب دیا اور مُردہ عمران کو بازوؤں میں اُٹھائے گھر کے گیٹ کی طرف چل پڑا۔

سدو نے ایک نظر دُور جاتے ہوئے رضوان پر ڈالی اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ اُس کے چہرے پر اُداسی اور دُکھ کی ملی جلی کیفیت طاری تھی۔

☆......☆......☆

گارڈ نے طنزیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھا اور پھر حقارت سے بولا۔"سلطان صاحب بھکاریوں سے نہیں ملتے۔ جاؤ پھوٹو یہاں سے۔"

"میں کسی سلطان سے ملنے نہیں آیا۔ تم شاید اُونچا سنتے ہو؟.........میں اسفند غوری سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"چھوٹے صاحب بھی نہیں ہیں گھر میں۔ جاؤ دفع ہو جاؤ۔" گارڈ نے نخوت سے جواب دیا۔

وہ بولا۔"تم نے کبھی راجو ٹارگٹ کلر کا نام سنا ہے؟"

گارڈ نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر کہا۔ ’’تمہارا.........راجو سے کیا تعلق ہے؟ شاید اُس کا نام لے کر مجھے ڈرانا...............‘‘

’’میں تجھے ڈرا نہیں رہا۔‘‘ اُس نے قطع کلامی کی۔ ’’بلکہ وارننگ دے رہا ہوں کہ اگر تم نے مجھے اسفند غوری سے نہ ملوایا تو میرے ایک اشارے پر تیری کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔ وہ سامنے بلڈنگ دیکھ رہے ہو نا؟ وہاں تیسری منزل کی کھڑکی میں میرا ایک ساتھی ڈور مار رائفل لیے موجود ہے۔ رائفل پہ ٹیلی سکوپ لگا ہوا ہے۔ نشانہ خطا ہونے کا ایک فی صد چانس بھی نہیں ہے۔‘‘

’’مم.........مگر تم نے تو اپنا نام رضوان بتایا ہے۔‘‘ گارڈ بوکھلا اُٹھا۔ ’’راجو کو تو آج تک کسی نے دیکھا بھی نہیں ہے؟‘‘

’’تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں راجو سے ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ جاؤ اسفند غوری سے بولو کہ اُس سے کوئی ملنا چاہتا ہے۔‘‘

’’کسی گارڈ کو کوٹھی کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہر ملاقاتی سے پہلے لالہ فیروز خان ملاقات کرتا ہے۔‘‘

وہ بولا۔ ’’تو لالہ فیروز خان سے ملاقات کرا دو میری۔‘‘

’’ٹھیک ہے جی آپ اِدھر اندر آ جائیں۔‘‘ گارڈ نے پہلی بار اُسے ادب سے مخاطب کیا تھا۔

وہ گارڈ کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ مین گیٹ کے ساتھ بنا ہوا یہ کمرا نا صرف استقبالیہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ بلکہ گیٹ پر تعینات گارڈز ڈیوٹی آف ہونے کے بعد آرام بھی اسی کمرے میں کرتے تھے۔ کمرے میں تین بیڈ اور مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے ایک بڑا سا صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ گارڈ نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر انٹر کام پر فیروز لالہ سے بات کرنے لگا۔ لالہ! آپ کسی راجو نام کے مشہور آدمی کو جانتے ہیں؟‘‘ گارڈ نے کن اکھیوں سے رضوان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’ کیوں.........تم کس لیے پوچھ رہے ہو؟‘‘ فیروز لالہ نے اُلٹا سوال کر دیا۔

وہ بولا۔ ’’راجو اس وقت یہاں استقبالیہ میں موجود ہے۔ وہ چھوٹے صاحب سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔‘‘

”اُسے کسی طرح ٹال دو یار! وہ تو بہت خطرناک انسان ہے۔“
”لالہ! میں نے ایسا کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں کہ وہ.............“ گارڈ نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔
”او کے میں آ رہا ہوں مگر اُسے استقبالیے سے باہر مت نکلنے دینا۔“ فیروز لالہ نے عجلت سے جواب دیتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔
گارڈ نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے رضوان کی طرف دیکھا اور پھر زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر سجاتے ہوئے بولا۔ ”فیروز خان لالہ آ رہا ہے۔“
اُس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور پھر کمرے کے دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد جو شخص اندر داخل ہوا اُسے دیکھ کر رضوان کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ وہ ایک دم اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مگر اس سے قبل کہ وہ منہ کھولتا نو وارد نے گارڈ کی نگاہیں بچاتے ہوئے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے رضوان کے چہرے سے شناسائی کے آثار غائب ہو چکے تھے۔ اب اُس کے چہرے پر مکمل اجنبیت طاری تھی۔ نو وارد آگے بڑھا اور اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ شاید یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ پلیز آپ اپنا تعارف وغیرہ کرا دیں؟“
”ناچیز کو رضوان تنولی کہتے ہیں۔ اسی شہر کا باسی ہوں اور ایک میڈیسن کمپنی میں کام کرتا ہوں۔“ اُس نے یوں جواب دیا جیسے انٹرویو دینے لگا ہو۔
نو وارد بولا۔ ”او کے........ میرا نام فیروز خان ہے اور میں فیروز لالہ کے نام سے مشہور ہوں۔ کہیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“
”ہوں فیروز لالہ۔“ وہ مسکرایا۔ ”اچھا نام ہے اور آپ کی شخصیت کے عین مطابق ہے۔“
”تو آیئے۔“ فیروز لالہ نے اُس کا ہاتھ پکڑا۔ ”گیسٹ روم میں میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“
رضوان اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اُس کے ساتھ چل دیا۔
”تمہاری اداکاری کی داد دینا پڑے گی فیروز لالہ۔“ کمرے سے باہر نکلتے ہی رضوان مسکرایا۔

''تو اور کیا کرتا؟ مجبوری کے عالم میں تجھے ''آپ جناب'' کہنا پڑا۔'' فیروز لالہ نے جواب دیا۔

☆......☆......☆

''یہ......یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' فیروز لالہ نے پریشانی کے عالم میں اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔'' چھوٹے صاحب بھلا ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟......نہیں راجو! مجھے لگتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے؟''

وہ بولا۔'' فیروز لالہ! ہم نے برسوں مل کر کام کیا ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ یہ سب کچھ تو میری نظروں کے سامنے ہوا ہے۔ اُس کی اسپورٹس کار کی نمبر پلیٹ بطور ثبوت میرے پاس موجود ہے۔''

''چلو مان لیا کہ یہ سب کچھ جو تم نے بتایا ہے۔ سچ ہے۔ لیکن اس مسئلے کا حل کیا ہوگا؟''

''یہ میں تم پر چھوڑتا ہوں۔ تم کیا کہتے ہو؟''

''میں سلطان صاحب سے کہہ کر تمہیں خون بہا دلا سکتا ہوں۔'' فیروز لالہ نے آفر کی۔

''واہ فیروز لالہ واہ......'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔'' مالک کا وفادار ہو تو تمہارے جیسا۔ ہم نے بھائیوں کی طرح وقت گزارا ہے۔ کیا وہ تمہیں یاد نہیں رہا؟ کیا تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ تمہاری یہ زندگی میرے ہی ایثار کا نتیجہ ہے......بھول گئے ہو تم نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا؟''

'' دیکھ راجو!'' فیروز لالہ نے ناصحانہ انداز میں کہا۔'' تمہارا بچہ کیا اسفند غوری کو مارنے کے بعد واپس آجائے گا؟......نہیں نا! تو پھر خون بہا لینے میں حرج ہی کیا ہے اور پھر یہ بھی تو سوچو نا کہ یہ ایک حادثہ تھا۔ اسفند غوری نے جان بوجھ کر تو تمہارے بیٹے کو نہیں مارا۔ میں تو تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ خون بہا لے کر اس معاملے کو یہیں ختم کر دو ورنہ سلطان صاحب بہت ظالم انسان ہیں۔ تم اُن کا مقابلہ نہیں کر پاؤ گے۔''

''کون سلطان اور کہاں کا سلطان؟''

''اسفند غوری کا باپ سلطان ارجمند غوری، کیا تم نے اُن کا نام کبھی نہیں سنا؟''

''اوہ......'' اُس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔'' تو وہ سلطان کہلاتا ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم کسی سلطنت کے سلطان کی بات کر رہے ہو؟''

’’وہ کسی سلطنت کے سلطان سے کم نہیں ہے۔تم کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔‘‘ فیروز لالہ نے جواب دیا۔

’’غلط فہمی تو شاید تجھے ہو رہی ہے۔میں دونوں باپ بیٹے کو دیکھ لوں گا۔‘‘

’’اس کا مطلب ہے کہ تم مجھ سے دشمنی مول لو گے۔‘‘ فیروز لالہ نے کہا۔’’ مجھے اُنہوں نے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے ہی رکھا ہوا ہے۔‘‘

’’ میری طرف سے پہل نہیں ہو گی فیروز لالہ! میں تجھے آج بھی اپنا بڑا بھائی سمجھتا ہوں۔جب تک تمہارا ہاتھ میرے خلاف نہیں اُٹھے گا تب تک یہ رشتا قائم رہے گا۔بصورتِ دیگر اگر تم نے میرے خلاف اپنے مالک کا ساتھ دیا تو پھر میں یہ بھول جاؤں گا کہ میں نے کبھی تمہاری زندگی بچائی تھی؟ بہتر ہو گا کہ خود کو اس معاملے سے دُور رکھو۔یہ میرا اور اسفند غوری کا معاملہ ہے۔‘‘

فیروز لالہ بولا۔’’اگر چھوٹے صاحب کو تم نے ہاتھ بھی لگایا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔‘‘

وہ ہنسا۔’’فیروز لالہ! تم تو کیا پوری دنیا مل کر بھی اُسے میرے انتقام سے نہیں بچا سکتی۔جس دن وہ مجھے نظر آ گیا وہ اُس کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔‘‘

’’ راجو! تم میرے محسن ہو اور میں نہیں چاہتا کہ میرا محسن میرے ہی ہاتھ سے مارا جائے۔خون بہا لے کر معاملہ ختم کر دو۔یہی تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔‘‘

’’فیروز لالہ! خون بہا وہ لیتے ہیں جن کی ہڈیوں میں گودے کی بجائے پانی بھرا ہوتا ہے۔‘‘

’’ایسے ڈائیلاگ فلموں میں اچھے لگتے ہیں اور.........‘‘

’’اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔‘‘ اُس نے قطع کلامی کی۔’’ کہ یہ فلمی ڈائیلاگ تھے یا حقیقی؟ اور وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے۔‘‘

’’جاؤ جو کر سکتا ہے کر لے۔‘‘ فیروز لالہ نے چیلنج کے انداز میں جواب دیا۔

’’میں جو بھی کروں گا تجھ سے اجازت لے کر نہیں کروں گا۔‘‘

’’راجو!‘‘ اُس نے انگلی کھڑی کرتے ہوئے کہا۔’’ چلے جاؤ یہاں سے ورنہ میرا دماغ گھوم گیا تو تمہارا کھیل یہیں ختم ہو جائے گا۔‘‘

''کھیل تو اب شروع ہوگا فیروز لالہ۔'' رضوان نے ذو معنی انداز میں جواب دیا اور پھر تیزی سے اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

''سدو! تم ماں کو ہمارے گھر بھیج رہے ہو یا نہیں؟'' اُس نے حتمی انداز میں پوچھا۔

وہ بولا۔''ارم! پلیز میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو، میں ابھی شادی افورڈ نہیں کرسکتا۔ مجھے ابھی بہت سارے قرض چکانے ہیں۔''

اُس نے کہا۔''اور وہ قرض تم یہ ٹیکسی چلا کر اُتار و گے، کیا یہ ممکن ہے؟''

''تم شاید پوری طرح میری بات سمجھ نہیں پائیں میں نے کسی اور قرض کی بات کی ہے۔ کچھ قرض ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں چکاتے ہوئے بدلے میں جان دینی پڑتی ہے۔ اس لیے فی الحال تم انتظار کرو کہ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔''

''یہ........ یہ تم کس قرض کی بات کر رہے ہو؟'' ارم کے انداز سے حیرت کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی چھلک رہی تھی۔

''بس ہے ایک قرض جو میرے ذمہ واجب الادا ہے اور مجھے مرنے سے پہلے یہ قرض چکانا ہے۔''

''کیا مجھے نہیں بتاؤ گے؟''

''قبل از وقت بتا کر تجھے پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ جب قرض چکانے کا وقت آ گیا تو تجھے ضرور بتاؤں گا۔''

''نہیں آج تو میں یہ بات جان کر ہی رہوں گی۔ میں نے ہمیشہ تمہیں انہی خدشات میں مبتلا دیکھا ہے۔''

وہ بولا۔''ارم میری جان! خدا کی قسم اگر یہ بات بتانے والی ہوتی تو میں سب سے پہلے تجھے بتاتا۔ پلیز ضد نہ کرو میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرو........ چلو آؤ آج تجھے آئس کریم کھلاتا ہوں۔''

''میں بچی نہیں ہوں کہ آئس کریم کے ایک کپ سے بہل جاؤں گی۔'' اُس نے تنک کر جواب دیا۔

''او کے دو کھا لینا۔'' وہ ہنسا۔

''دانت مت نکالو بہت بدصورت لگتے ہو۔''

''دل سے کہہ رہی ہو کہ صرف زبان سے؟'' اُس نے ہنس کر پوچھا۔

''نہیں بتاؤں گی۔'' وہ چڑ کر بولی۔ ''تمہیں جب مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو میں کس لیے تم پر اعتماد کروں؟''

''دیکھو میری جان!'' وہ اُس کا نرم وگداز ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔ ''میں تم سے بے حد پیار کرتا ہوں۔ اتنا کہ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں مگر یہ معاملہ ایسا ہے کہ فی الحال اسے مخفی رکھنا بہت ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے یہ قرض چکاتے وقت مجھے کبھی تمہاری ضرورت پڑ گئی تو وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں ضرور بلاؤں گا۔ چلو اب غصہ تھوک کسی کیفے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

''نہیں۔'' اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں آنٹی اور انکل سے ملنا چاہتی ہوں؟''

''اُن سے مل کر کیا کرو گی؟'' سدو نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''بھئی! میں اُن کی ہونے والی بہو ہوں۔ جب چاہوں اُن سے مل سکتی ہوں۔ تم کون ہوتے ہو سوال کرنے والے؟''

''او کے ٹھیک ہے لیے چلتا ہوں مگر امی سے یہ بات مت کہنا کہ میں کوئی قرض چکانا چاہتا ہوں۔ وہ خواہ مخواہ پریشان ہوجائیں گی۔''

''نہیں کہوں گی۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اب چلو مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

''تشریف رکھیے میڈم۔'' وہ ٹیکسی کی عقبی کھڑکی کھولتے ہوئے بولا۔ ''غلام ابھی لیے چلتا ہے۔''

ارم مسکراتے ہوئے ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ سدو نے اسٹیرنگ سنبھالا اور ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ لگ بھگ نصف گھنٹے کے بعد وہ سدو کے گھر پہنچ گئے۔ سدو کی ماں ارم کو دیکھ کر خوشی سے کھل اُٹھی۔

''کتنے عرصے کے بعد چکر لگایا ہے۔ تم بھی نا! اب کٹھور ہوتی جا رہی ہو؟'' سدو کی ماں نے مسکرا کر شکایت کی۔

''ارے یہ کیا آنٹی! سدو تو اب بھی مجھے یہاں لانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ تو میں زبردستی آگئی ہوں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہے بیٹے!'' اُس نے سدو کی طرف دیکھا۔ ''شادی ابھی تک ہوئی نہیں ہے اور ان بن پہلے سے شروع ہوگئی؟''

''نہیں امی! یہ جھوٹ بولتی ہے۔ میں نے تو اسے کبھی انکار نہیں کیا۔''

وہ بولی۔ ''بہتر ہوگا کہ اب تم دونوں کی شادی کردی جائے۔ اس کے بعد شوق سے لڑتے رہنا۔''

''شادی بھی ہو جائے گی امی! او کے آپ لوگ باتیں کریں میں ابو کو دیکھتا ہوں۔'' وہ عجلت کے انداز میں کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

''دیکھا آنٹی! آپ کا لاڈلا شادی کا نام سنتے ہی کیسے بدک کر بھاگ گیا ہے؟'' ارم شکایتی انداز میں بولی۔ ''جب کہ اُدھر ہمارے گھر میں امی اور ابو روزانہ میری شادی کے موضوع پر ہی لگے رہتے ہیں۔ خاص کر امی تو چاہتی ہیں کہ بس ابھی کہ ابھی مجھے رخصت کردیں۔''

''کیوں......ساجدہ بہن کیا تمہیں بوجھ سمجھنے لگی ہیں؟ میں خود اُن سے بات کروں گی۔ وہ کون ہوتی ہیں میری بہورانی کو تنگ کرنے والی؟''

وہ بولی۔ ''نفیسہ آنٹی! اس میں امی بچاری کا کیا دوش ہے؟ بیٹیوں کو تو آج کل سبھی بوجھ سمجھتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی تو سوچنا! کہ امی کے کندھوں پر تو ایک کی بجائے چار چار جوان بیٹیوں کا بوجھ ہے۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹی! تُو کیوں فکرمند ہوتی ہے۔ میں ہوں نا! اللہ نے چاہا تو تمہاری سب بہنوں کے رشتے اچھے خاندانوں میں ہوں گے۔'' نفیسہ آنٹی نے اُسے تسلی دیتے ہوئے جواب دیا۔

''بس آپ ہی کا تو آسرا ہے آنٹی! ورنہ دل چاہتا ہے گھر سے کہیں بھاگ جاؤں۔''

''ناں......ایسی باتیں نہیں کرتے۔'' نفیسہ آنٹی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں آج ہی سدو کے ابا سے بات کرتی ہوں......اچھا اب یہ بتا کہ چائے چلے گی یا ٹھنڈا؟''

''چائے ٹھیک رہے گی آنٹی! مگر بناؤں گی میں خود۔'' ارم نے جواب دیا اور پھر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

بڑے صاحب اپنی وسیع و عریض کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں ایک نفیس صوفے پر براجمان گہری سوچ میں غرق تھے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک سلگتا ہوا امپورٹڈ سگار موجود تھا۔ سگار کی خوشبو پورے ڈرائنگ روم میں پھیلی ہوئی تھی۔ بڑے صاحب نے ایک کش لگایا، دھواں فضا میں چھوڑا اور پھر صوفے سے اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ اُن کے ماتھے پر شکنوں کا ایک جال سا بنا ہوا تھا۔ اُس وقت وہ کریم بھائی کے متعلق سوچ رہے تھے۔ جس نے تھوڑا ہی

عرصہ قبل بڑے صاحب کی پارٹی جوائن کی تھی۔ مگر آج وہ پارٹی لیڈر بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ کریم بھائی کی یہ جرأت بڑے صاحب کے نزدیک ناقابلِ معافی جُرم تھا۔ ابھی اُس کے نئے نئے پر نکلے تھے اور وہ اُڑنے کی تگ ودو کر رہا تھا۔ لیکن بڑے صاحب اُڑان بھرنے سے پہلے ہی اُس کے پر نوچ لینا چاہتے تھے۔ وہ ہمیشہ سے تشدد کی سیاست کے قائل چلے آرہے تھے۔ اُن کے نزدیک سیاست اور تشدد لازم وملزوم تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے اُنہیں بڑی دیر ہوگئی مگر اس مسئلے کا کوئی مناسب حل اُن کے ذہن میں نہیں آیا۔ تھک کر وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ ایسے ہی وقت ایک گھریلو ملازم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور مؤدب میں بولا۔ ”سائیں! ایک بندا ملاقات کی غرض سے آیا ہے۔“

”ارے بابا! اُس سے نام پتا پوچھا ہے کہ ایسے ہی چلے آئے ہو۔ کون ہے کہاں سے آیا ہے اور ہم سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟“ بڑے صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

”سائیں! وہ اپنا نام راجو بتاتا ہے۔“

”تم نے ٹھیک سے تو سنا ہے نا! بابا؟“ بڑے صاحب نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں سائیں! میں نے پورا پتا کرلیا ہے۔ اُس کا اصل نام رضوان ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ آپ اُسے راجو کے نام سے جانتے ہیں۔“

”تو بابا! اُسے جلدی سے اندر بھیجو اور کچھ کھانے پینے کے لیے بھی لے آؤ۔“ بڑے صاحب نے حکمیہ انداز میں جواب دیا اور ملازم تیزی سے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں کے بعد رضوان راجو اندر داخل ہوا تو بڑے صاحب اُسے دیکھ کر کھل اُٹھے۔ ”ہمیں پتا تھا بابا! ایک دن تم نے اِدھر ہی آنا ہے۔“

”ہاں بڑے صاحب!“ راجو نے اُداسی کے عالم میں کہا۔ ”مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ اب میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔“

”راجو! اگر صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔“ بڑے صاحب نے قہقہہ لگایا۔ ”ویسے بھی ہم تجھے اپنا بیٹا سمجھتے ہیں۔ کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی اور نہ آئندہ ہونے دیں گے۔“

''آپ کے یہی احسان تو مجھے واپس کھینچ لائے ہیں ورنہ..........''

''ہمیں سب خبر ہے بابا!'' بڑے صاحب نے ہاتھ اُٹھا کر قطع کلامی کی۔ ''تجھے ارجمند غوری کی دشمنی یہاں کھینچ لائی ہے۔ ورنہ ہمارے بلانے سے تُو کب واپس آنے والا تھا؟''

وہ بولا۔ ''بڑے صاحب! میں جب تک اسفند غوری کو جہنم رسید نہیں کر دیتا تب تک مجھے کسی پل بھی چین نہیں آئے گا۔ بس آپ سے اتنی گزارش کرنے کے لیے آیا تھا کہ آپ میرے مقابلے میں ارجمند غوری کا ساتھ نہیں دیں گے۔''

''ارے بابا! نہیں دیں گے بالکل نہیں دیں گے لیکن تمہیں واپس آنا پڑے گا ہمارے پاس........ بولو منظور ہے؟''

''منظور نہ ہوتا تو آپ کے در پہ کبھی نہ آتا۔'' اُس نے پُرعزم لہجے میں جواب دیا۔

''تو جاؤ بابا شوق سے اپنا بدلہ لو........ ویسے یہ ارجمند غوری آج کل ہمارے لیے بھی دردِ سر بنتا جا رہا ہے۔ ہماری مہربانیوں کو اس نے ہماری بزدلی سمجھ لیا ہے۔ کریم بھائی کو ہمارے خلاف آئے دن اُکساتا رہتا ہے۔''

''بڑے صاحب! میں وعدہ کرتا ہوں کہ ان سب کو صفحۂ ہستی سے مٹا دوں گا۔ بس مجھے آپ کے دستِ شفقت کی ضرورت ہے۔''

''ارے بابا! ہمارا دستِ شفقت تو ہمیشہ تمہارے سر پہ رہا ہے۔ بس تم ہی ہمیں چھوڑ جاتے ہو۔'' بڑے صاحب نے مسکرا کر شکوہ کیا۔

وہ بولا۔ ''اب ایسا کبھی نہیں ہو گا بڑے صاحب! ہم جیسوں کو شرافت کی زندگی کبھی راس نہیں آتی۔ آغاز بھی گولی انجام بھی گولی۔''

بڑے صاحب نے کہا۔ ''راجو! ہمیں لگتا ہے اب تم موت سے ڈرنے لگے ہو۔ پہلے تو تم نے کبھی ایسے مایوسی کی باتیں نہیں کی تھیں؟''

''نہیں بڑے صاحب! میں موت سے نہیں ڈرتا البتہ نازنین کی وجہ سے اب قدرے محتاط رہنا پڑتا ہے۔ عمران کی موت کے بعد تو وہ بے چاری بالکل ہی ٹوٹ گئی ہے۔ پہلے تو عمران کے ساتھ اُس کا دل بہلا رہتا تھا۔ لیکن اب تو وہ........''

’’تم اُسے یہیں لے آؤ، یہاں نوکر چاکر ہیں اُس کا خیال رکھنے کے لیے۔‘‘ بڑے صاحب نے قطع کلامی کی۔

’’بہت بہتر بڑے صاحب۔‘‘ اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور سلام کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ موٹر بائیک پہ سوار ٹیکسی اسٹینڈ کا رخ کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

سدو ٹیکسی اسٹینڈ کے چائے خانے میں بیٹھا دودھ پتی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جب اچانک اُس کی نظر رضوان پر پڑی جو متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ جلد ہی رضوان نے اُسے تاڑ لیا اور مسکراتا ہوا اُس کے قریب آ کر خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد سدو نے ایک دودھ پتی کا آرڈر دیا اور پھر شکایتی انداز میں بولا۔ ’’آپ تو جناب غائب ہی ہو گئے تھے۔ میں نے آپ کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔‘‘

’’تم فون پر بھی تو بات کر سکتے تھے۔‘‘ رضوان نے دودھ پتی کا کپ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ’’میں نے تمہیں اپنا نمبر دیا تھا نا؟‘‘

’’نہ وہ فون رہا ہے اور نہ نمبر۔‘‘ سدو نے قہقہہ لگایا۔ ’’یہاں ہر ہفتے نیا فون خریدنا پڑتا ہے۔‘‘

’’چلو کوئی بات نہیں فون اور آ جائے گا۔ فی الحال مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔‘‘

’’شوق سے کرو میں سن رہا ہوں۔‘‘

وہ بولا۔ ’’سدو! یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔ کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے اگر ایسی ہی کوئی خاص بات ہے تو پھر میرے گھر چلے چلتے ہیں۔ امی اور ابو کو آپ سے ملنے کا بہت شوق ہے۔ اسی بہانے آپ کی اُن سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔‘‘ سدو نے جیب سے والٹ نکالتے ہوئے جواب دیا۔

’’اوکے۔‘‘ رضوان نے سر ہلا کر اُس کی تائید کی۔

سدو نے والٹ سے ایک نوٹ نکال کر بل چکایا اور پھر وہ دونوں چائے خانے سے باہر نکل گئے۔

باہر نکل کر سدو بولا۔ ’’آپ ٹھہریں، میں ٹیکسی نکال لاتا ہوں۔‘‘

ذرا دیر کے بعد وہ دونوں سدو کے گھر کی طرف روانہ تھے۔ سدو اپنی ٹیکسی میں آگے تھا۔ جب کہ رضوان اُس کے پیچھے اپنی بائیک پر تھا۔ پون گھنٹے کی ڈرائیونگ کے وہ سدو کے گھر پہنچ گئے۔ سدو نے جب ماں سے اُس کا تعارف کرایا تو نفیسہ بیگم مسکرا کر بولی۔ ”بیٹے! یہ سدو گھر میں اکثر تمہارا ذکر کرتا رہتا ہے۔ اس لیے مجھے تم سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ اچھا ہوا کہ تم سدو کے ساتھ خود ہی آ گئے۔“

وہ بولا۔ ”آنٹی! اگر میں یہ کہوں کہ یہاں میں کسی مقصد کے تحت آیا ہوں تو شاید آپ کو بُرا لگے گا۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ یہاں مجھے میری ضرورت کھینچ لائی ہے۔“

”کوئی بات نہیں بیٹے! انسان ہی انسانوں کے کام آتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہو گی تمہارے کام آ کر، تم بلا جھجک ہو کر اپنی ضرورت بتاؤ، ہمارے بس میں ہوئی تو ضرور پوری کریں گے۔“

وہ بولا۔ ”آنٹی! میں اپنی ضرورت سدو کو بتاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مجھے انکار نہیں کرے گا۔“

”جان بھی حاضر ہے رضوان بھائی......آپ حکم تو کریں؟“ سدو نے پُر جوش انداز میں مداخلت کی۔

”ابھی نہیں جب وقت آئے گا تو ضرور بتاؤں گا۔“

”تو چلیے پھر میں آپ کو ابو جان سے ملاتا ہوں۔“ سدو اُٹھتے ہوئے بولا۔ ”امی! آپ چائے وہیں لے آئیں۔“

”تم لوگ جاؤ، میں ابھی چائے لاتی ہوں۔“ نفیسہ بیگم نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ سدو کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوا تو اُسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ کمرے میں موجود شخص اُس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ اُسے اچھی طرح جانتا تھا۔ تاہم وہ شخص اُسے نہیں جانتا تھا۔ اُس کے سامنے ایک معروف اخبار کا ایڈیٹر محمود غزنوی موجود تھا۔ جو منہ میں قلم پکڑ کر کچھ لکھ رہا تھا۔ کیوں کہ اُس کے دونوں ہاتھ کلائیوں سے کٹے ہوئے تھے مگر وہ ہونٹوں میں قلم تھامے نہایت ہی روانی کے ساتھ لکھ رہا تھا۔ رضوان نے سلام کیا تو اُس نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔

رضوان بولا۔ ”جناب! مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“

محمود غزنوی نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلانے لگا۔
''سر! کیا آپ نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے؟'' رضوان نے ہنس کر پوچھا۔
محمود غزنوی نے چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔''ابو! یہ میرا دوست ہے رضوان۔ اسے میں نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ آپ بول نہیں سکتے۔ تاہم اس کا اور ہمارا دشمن ایک ہی ہے۔ ارجمند غوری، وہی ارجمند غوری جس نے آپ کے ہاتھ کاٹنے کے ساتھ ساتھ آپ کو قوت گویائی سے بھی محروم کر دیا تھا۔''
ارجمند غوری کا نام سن کر محمود کے چہرے پر اذیت وحقارت کے ملے جلے تاثرات اُبھر کر معدوم ہو گئے۔ رضوان نے اُلجھن آمیز نگاہوں سے سدو کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔''رضواں بھائی! ابو کی اس حالت کا ذمہ دار ارجمند غوری ہے۔ وہ ظالم انسان جو اس شہر کا فرعون بنا ہوا ہے۔''
''لیکن کیوں........غوری کی آپ لوگوں سے کیا دشمنی تھی؟'' رضوان نے سوال کیا۔
''کوئی دشمنی نہیں تھی۔'' سدو نے تاسف کے عالم میں سر ہلایا اور پھر سارا واقعہ تفصیل کے ساتھ اُس کے سامنے بیان کر دیا۔
''اوہ تو یہ بات ہے۔'' اُس نے معنی خیز نظروں سے سدو کی طرف دیکھا۔''میں سمجھ گیا مسٹر مسعود غزنوی عرف سدو بھائی اتم تو میرے بھی اُستاد نکلے۔ بھئی داد دینا پڑے گی تمہاری اس پلاننگ کی۔''
''پلاننگ......کیسی پلاننگ......رضوان بھائی؟'' سدو نے حیرت کے عالم میں پوچھا۔
''انکل کو پتا ہے تمہاری اس منصوبہ بندی کا؟'' رضوان نے اُلٹا سوال کر دیا۔
''کک......کیسی منصوبہ بندی؟'' سدو بدستور اُلجھا ہوا تھا۔''آپ کچھ بتائیں گے تو مجھے معلوم ہوگا نا؟''
''تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟''
''کک......کچھ......بھی نہیں......جانتا۔'' سدو نے ہکلا کر جواب دیا۔
''جھوٹ بول رہے ہو تم۔'' وہ چلایا۔''اپنے باپ کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟''
''سوری رضوان بھائی! میں شرمندہ ہوں آپ سے۔'' سدو نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

''مطلب تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو؟'' اس بار رضوان نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ہاں۔'' سدو نے اثبات میں سر ہلایا۔

''او کے......اُٹھو چلیں۔'' رضوان کے لہجے میں تحکم تھا۔

''کک......کہاں؟'' سدو نے خائف ہو کر پوچھا۔

وہ بولا۔''مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں جو یہاں انکل کے سامنے مناسب نہیں ہوں گی۔اس لیے میرے فلیٹ پر چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' سدو نے اثبات میں سر ہلایا۔

رضوان محمود غزنوی کی طرف متوجہ ہوا، جو بڑی دیر سے پریشانی کے عالم میں اُن کی گفت گو سن رہا تھا۔''انکل! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔میرے ہوتے ہوئے سدو کا کوئی بال بیکا بھی نہیں کر سکتا۔''

محمود پریشانی کے عالم میں سدو کی طرف دیکھنے لگا۔

سدو بولا۔''ابو! آپ پریشان نہ ہوں۔بس میرے لیے دعا کریں اور ہاں امی کو اس بارے میں کچھ بھی بتانے سے گریز کریں وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گی۔''

ایسے ہی وقت نفیسہ بیگم ایک ٹرے لیے اندر داخل ہوئی جس میں چائے کے ساتھ ساتھ کھانے کی کچھ ہلکی پھلکی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔سو اُن دونوں کو چائے پینے کے لیے کچھ دیر رکنا پڑا۔

☆......☆......☆

فیروز لالہ نے ارجمند غوری کو یہ بتا دیا تھا کہ اسفند غوری کی زندگی خطرے میں ہے۔مگر یہ نہیں بتایا تھا کہ کس سے اُسے خطرہ ہے؟ غالباً اُسے اپنے ماضی کے دوست سے ہمدردی تھی، جس نے کبھی اپنی جان پر کھیل کر اُس کی جان بچائی تھی۔اُسے آج بھی وہ مناظر یاد تھے۔جب سکیورٹی فورسز نے اُنھیں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور وہ گرفتاری پیش کرنے کی بجائے مقابلے پر تل گئے تھے۔اُن پر چاروں طرف سے گولیاں برس رہی تھیں۔جن کی تڑتڑاہٹ سے پورا علاقہ گونج رہا تھا۔وہ دونوں بھی جوابی فائرنگ کر رہے تھے۔مگر سکیورٹی اہل کاروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔چنانچہ وہ تیزی سے اُن کے قریب آتے جا رہے تھے۔جب کہ اُن دونوں کی

مدافعت لحہ بہ لحہ کم زور پڑتی جا رہی تھی۔ اُن کے پاس گولیاں بھی ختم ہونے کے قریب تھیں۔ ایسے ہی وقت راجو چلایا۔ ”فیروز لالہ! تم بھاگ جاؤ میں انہیں روکتا ہوں۔“

”کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟“ فیروز لالہ نے چیخ کر پوچھا۔ ”میں بھلا تجھے اکیلا چھوڑ کر کیسے بھاگ سکتا ہوں؟“

”لالہ! تجھے میری قسم بھاگ جاؤ، گن پھینکو، چہرے سے نقاب اُتارو اور عقبی راستے سے نکل جاؤ، تجھے کوئی بھی نہیں پہچان سکے گا۔“

”مگر.........راجو.........میں.........میں.........یہ.........“

”لالہ! تم وقت ضائع کر رہے ہو۔“ راجو نے چلا کر اُس کی بات کاٹی۔ ”یقین کرو مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ البتہ اگر تم نہ گئے تو ہم دونوں کتے کی موت مارے جائیں گے۔ پلیز میری بات مان لو پلیز.........“

چارو نا چار فیروز لالہ نے اُس کی ہدایت پر عمل کیا اور وہاں سے چھپتا چھپاتا نکل گیا۔ تاہم اُسے آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ راجو وہاں سے کیسے نکلا تھا؟

ارجمند غوری کے بار بار کے استفسار پر فیروز لالہ نے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ کوئی ٹارگٹ کلر ہے جو اسفند غوری کو مارنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ارجمند غوری نے اکلوتے بیٹے کی سکیورٹی کا خاطر خواہ انتظام کر دیا تھا۔ دو عدد گارڈز جو کہ جدید اسلحے سے مسلح تھے ہر وقت اسفند غوری کے ساتھ رہتے تھے۔ گو کہ گارڈز کی موجودگی میں وہ کوفت محسوس کیا کرتا تھا لیکن باپ کے سامنے اُسے دم مارنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ فطرتاً اسفند غوری ایک عیاش طبع شخص تھا۔ اس لیے گارڈز کی موجودگی اُسے ہمیشہ کھٹکتی رہتی تھی۔ اُس کے بس میں ہوتا تو اُن گارڈز کو کھڑے کھڑے فارغ کر دیتا مگر باپ کے خوف نے اُس کی زبان پر مصلحت کے تالے لگا رکھے تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن ساحلِ سمندر پر جانا اُس کی کم زوری تھی۔ ساحلِ سمندر پر ہمیشہ اُسے اپنا من پسند شکار مل جاتا تھا۔ تاہم گزشتہ کچھ روز سے گارڈز کی موجودگی نے اُس کا یہ دھندا چوپٹ کر رکھا تھا اور وہ سخت بے چین تھا۔ اُسے کسی نہ کسی طرح ان گارڈز سے جان چھڑانا تھی۔ تبھی وہ اپنا شوق پورا کر سکتا تھا۔

اُس روز جب وہ دوپہر کے وقت ناشتا کرنے کے بعد کوٹھی سے نکلا تو حسبِ معمول دونوں گارڈز اُس کے

ساتھ تھے۔دل ہی دل میں وہ اُن سے جان چھڑانے کا پلان سوچنے لگا۔مگر کوئی مناسب پلان اُسے بھائی نہیں دے رہا تھا۔کہتے ہیں کہ آدمی کی جب موت آتی ہے تو وہ خود ہی اس سمت بھاگ اُٹھتا ہے۔جہاں موت اُس کی منتظر ہوتی ہے۔اسفند غوری کی موت کا وقت بھی قریب آچکا تھا۔لہٰذا وہ بھاگ کر اُسی سمت جانا چاہتا تھا۔اُس وقت وہ ایک ویران سڑک سے گزر رہے تھے۔جب اچانک ایک فول پروف پلان اُسے سوجھ گیا۔دونوں گارڈز گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔سو وہ اسفند غوری کی چالاکی سے واقف ہی نہ ہو سکے۔اسفند غوری نے چلتی گاڑی کا انجن بند کر دیا اور گاڑی تھوڑی دور جا کر خود بخود رک گئی۔

''اوہ شٹ......اسے بھی ابھی خراب ہونا تھا۔''اُس نے جھنجھلا کر اسٹیئرنگ وہیل پر ایک مکا مارا۔

''کیا ہوا جناب؟''عقبی نشست سے ایک گارڈ نے استفسار کیا۔

''پتا نہیں چلتے چلتے خود ہی بند ہو گئی ہے۔شاید انجن میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔''اُس نے پریشانی کے عالم میں جواب دیا۔

''نو پرابلم سر!یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ہم نیچے اُتر کر گاڑی کو دھکا لگاتے ہیں۔ابھی اسٹارٹ ہو جائے گی۔''گارڈ نے عین اُس کی توقع کے مطابق مسئلے کا حل بتایا تو وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

''سوری۔''وہ قدرے نادم ہو کر بولا۔''تم لوگوں کو تکلیف دے رہا ہوں۔یہاں قریب کوئی ورکشاپ بھی تو نہیں ہے ورنہ........''

''کوئی بات نہیں جناب۔''گارڈ نے فوراً قطع کلامی کی۔''یہ تو ہماری ڈیوٹی ہے۔تکلیف کیسی؟''

دوسرے ہی لمحے دونوں گارڈ گاڑی سے نیچے اُترے اور گاڑی کو عقب سے دھکا لگانے لگے۔گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔تبھی اچانک اُس نے اگنیشن میں لگی چابی گھما دی۔گاڑی کا طاقتور انجن ایک دم سے غرایا اور دوسرے ہی لمحے گاڑی تیزی سے آگے نکل گئی۔جب کہ گارڈ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔اُن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اسفند غوری یوں اُنہیں دھوکا دے جائے گا۔سوائے ہاتھ ملنے کے وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔

☆......☆......☆

گارڈز کو نچہ دے کر وہ سیدھا ساحلِ سمندر پہ پہنچ گیا۔ گاڑی کو حفظِ ماتقدم کے طور پر اُس نے درختوں کے ایک جھنڈ میں پارک کیا اور چہل قدمی کے انداز میں ساحل کی طرف چل پڑا۔ اُس کی نگاہیں اِدھر اُدھر یوں گھوم رہی تھیں جیسے اُسے کسی کی تلاش ہو۔ وہاں بہت سے لوگ گھوم رہے تھے۔ کچھ من چلے سمندر کی تند لہروں کے ساتھ قوت آزمائی میں بھی مصروف تھے۔ کتنے ہی لوگوں کو وہ بے رحم سمندر نگل چکا تھا مگر لوگوں نے کبھی نصیحت حاصل نہیں کی تھی۔ وہ مرنے کے لیے خود ہی وہاں پہنچ جاتے تھے۔ یونہی گھومتے گھومتے معاً اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ بالکل وہی تھی جو گزشتہ کئی دنوں سے اُسے وہاں اکیلے گھومتے ہوئے نظر آ رہی تھی۔ جینز کی چست پتلون اور سلیولس شرٹ میں وہ دیکھنے والوں پر بجلیاں گراتی ساحل پر چہل قدمی کر رہی تھی۔ پتلون کے پائنچے اُس نے گھٹنوں تک چڑھائے ہوئے تھے۔ اُس کی سرخ و سفید اور گداز پنڈلیاں دیکھ کر اسفند غوری کے دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہونے لگیں اور منہ میں جیسے شہد سا گھلنے لگا۔ وہ جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھا اور چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے اُس دشمنِ جاں سے مخاطب ہوا۔ ’’ہائے بے بی! آئی ایم اسفند غوری......کیا آپ مجھے چند لمحوں کی کمپنی دینا پسند فرمائیں گی؟‘‘

’’وائے ناٹ۔‘‘ وہ مسکرائی تو اُس کے موتیوں جیسے صاف و شفاف دانت چمکنے لگے۔ ’’آئی ایم ارم سعید......آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔‘‘

’’تھینک یو سو مچ ڈیئر۔‘‘ وہ یوں مسکرایا جیسے اُس سے برسوں کی شناسائی ہو۔ ’’آؤ کسی کیفے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ آئس کریم وغیرہ کھائیں گے۔‘‘

’’تم پاگل ہو مسٹر غوری۔‘‘ وہ ایک دم فری ہو گئی۔ ’’میں یہاں آئس کریم کھانے تو نہیں آئی۔‘‘ اُس کے لبوں پر ذومعنی مسکراہٹ تھی۔

’’اوہ یونانی گرل۔‘‘ اسفند غوری کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ ’’میں سمجھ گیا......بولو کہاں چلا جائے؟‘‘

’’میرے فلیٹ پر۔‘‘ اُس نے دُور درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ’’وہاں اُن درختوں کے عقب میں میرا فلیٹ ہے۔ وہاں میں اکیلی رہتی ہوں۔ چلو گے کیا؟‘‘

’’ضرور چلوں گا بے بی۔‘‘ خوشی سے اُس کی باچھیں چڑی ہوئی جا رہی تھیں۔ ’’تم کہو اور ہم نہ آئیں یہ بھلا

کیسے ممکن ہے؟''

''اوکے فالومی۔'' وہ مستانہ چال چلتی ہوئی آگے بڑھی تو اسفند غوری سدھائے ہوئے کتے کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

لگ بھگ دس منٹ کے بعد وہ ایک فلیٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ جو دو کمروں، کاریڈور اور کچن پہ مشتمل تھا۔ ارم نے ایک کمرے کا لاک کھولا اور اسفند غوری سے بولی۔ ''چلو اندر آجاؤ، یہاں ہر سہولت میسر ہے۔''

''سہولت کو گولی مارو بے بی! مجھے تو بس............'' بقیہ جملہ اُس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا اور وہ متحیر انداز میں اُن دو اشخاص کی طرف دیکھنے لگا جو ایک صوفے پر براجمان اُسے طنزیہ نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھ میں جدید ہتھیار موجود تھے۔ یہ رضوان اور سدو تھے۔

''موسٹ ویلکم.........موسٹ ویلکم مسٹر اسفند غوری۔'' رضوان نے باقاعدہ اُٹھ کر اُس کا استقبال کیا۔

''کک.....کون ہو تم لوگ اور مجھے یوں چارا ڈال کر یہاں کس لیے بلایا ہے؟'' اُس نے حتی الوسع لہجے کو بارعب بناتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تجھے چارا نظر آتی ہے اُلو کے پٹھے؟'' سدو سے ارم کی توہین برداشت نہ ہو سکی۔ ''چارا تو مچھلیوں کو ڈالا جاتا ہے اور تم تو گندے جوہڑ میں رینگنے والے کچھوے سے بھی بدتر ہو۔''

''حوصلہ سدو حوصلہ۔'' رضوان نے مداخلت کی۔ ''کیا تم نہیں جانتے کہ یہ ایک سلطان کا ولی عہد ہے؟''

''کون سا سلطان اور کہاں کا سلطان.......سلطان نام رکھ لینے سے کوئی سلطان تھوڑی بن جاتا ہے؟'' سدو نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

''سدو! مجھے لگتا ہے تم اپنے باپ کا انجام بھول گئے ہو، شاہوں سے پنگا لوگے تو زبان سے محروم کر دیے جاؤ گے اور تمہارے ہاتھوں کو..............''

''بس رضوان بھائی بس۔'' سدو ہاتھ اُٹھاتے ہوئے چلایا۔ ''اس سے آگے ایک لفظ بھی نہیں کہنا۔''

''سلطان نہ سہی ولی عہد ہی سہی سدو۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''کم سے کم اسے پتا تو چلنا چاہیے کہ اس کے باپ نے کیا کیا تھا؟''

سدو ایک دم صوفے سے اُٹھا اور بھوکے عقاب کی طرح اسفند غوری پر جھپٹ پڑا۔ اُس کا پہلا گھونسا اسفند کے چہرے پر پڑا۔ گھونسا اس قدر شدید تھا کہ اسفند غوری کی ناک سے خون ٹپکنے لگا۔ اُس نے چیختے ہوئے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ لیکن سدو پر تو جنون سوار ہو چکا تھا۔ اُس نے وحشیانہ انداز میں اسفند غوری کو گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ کمرے میں اسفند غوری کی چیخیں گونج رہی تھیں۔ وہ جوابی وار کرنے کی بجائے محض اپنے دفاع پر اکتفا کر رہا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سدو نے اُسے اُٹھایا اور پختہ فرش پر پٹخ دیا۔ اسفند غوری کے منہ سے ایک کرب ناک چیخ نکلی اور پھر وہ ذبح کیے ہوئے مُرغ کی طرح تڑپنے لگا مگر سدو کا جنون تھا کہ تھمنے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ اب وہ ہاتھوں کی بجائے لاتوں سے کام لے رہا تھا۔ اُس کی دونوں ٹانگیں میکانکی انداز میں چل رہی تھیں۔ منہ ناک دیکھے بغیر وہ نہایت ہی بے رحمانہ انداز میں اُسے ٹھوکر پہ ٹھوکر رسید کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسفند غوری چیختے چیختے بے ہوش ہو گیا۔ مگر سدو کے سینے میں اُبلتا ہوا لاوا سرد نہ ہوا وہ بدستور اُسے ٹھوکریں مار رہا تھا۔

''بس سدو بس۔'' رضوان نے اُٹھ کر اُسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ ''یہ مر گیا تو ہمارا سارا پلان دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔''

''چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو۔'' وہ ہذیانی انداز میں چلایا۔ ''میں آج اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''ہوش میں آؤ سدو!'' رضوان نے چیخ کر کہا۔ ''یہ کیا پاگل پن ہے؟ کیا سارا منصوبہ خاک میں ملا دو گے؟''

''سدو! رضوان بھائی ٹھیک کہتے ہیں۔'' ارم نے مداخلت کی۔ ''تمہارا یہ جنون سارا پلان چوپٹ کر دے گا۔ پلیز کنٹرول یور سیلف۔''

دونوں نے مل کر بڑی مشکل سے سدو کا غصہ ٹھنڈا کیا اور پھر بے ہوش پڑے ہوئے اسفند غوری کی طرف متوجہ ہو گئے۔

☆......☆......☆

ارجمند غوری اپنی مخصوص نشست گاہ میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر قبل اُس نے لالہ فیروز خان کو اُن دو گارڈز کی معیت میں اسفند غوری کو تلاش کرنے کے لیے بھیجا تھا، جنہیں اسفند دھوکا دے کر نکل گیا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں جب کہ چہرے پر غیظ و غضب کے تاثرات چھائے

ہوئے تھے۔ رہ رہ کر اُسے بیٹے پر غصہ آ رہا تھا۔ آج تک کسی نے بھی اُس کی حکم عدولی کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ لیکن آج اُس کے اپنے ہی بیٹے نے اُس کا سارا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔ غصے کی شدت سے اُسے اپنا خون رگوں میں کھولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"اسفند یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔" ٹہلتے ٹہلتے اُس نے خود کلامی کی۔ "ہم تمہارا وہ حشر کریں گے کہ تم عمر بھر یاد رکھو گے۔"

ایسے ہی وقت اُس کا سیل فون بجنے لگا۔ اُس نے فون نکال کر سکرین پر نظر ڈالی تو اسفند کا نام جھلملا رہا تھا۔

"کہاں مر گئے ہو تم؟" اُس نے کال ریسیو کرتے ہوئے گرج کر پوچھا۔

"زندہ ہے ابھی، کہو تو مار دوں؟" اُس کی سماعتوں سے ایک اجنبی آواز ٹکرائی۔

"کون ہو تم اور یہ بات کس لہجے میں کر رہے ہو؟ شاید تم ہمیں نہیں جانتے، ہم............"

"سن بے! گمنام ریاست کے خود ساختہ سلطان۔" اجنبی نے طنزیہ انداز میں بات کاٹی۔ "میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں لیکن تم مجھے نہیں جانتے۔ میں موت ہوں موت، جو دبے پاؤں آتی ہے اور بڑے بڑے شاہوں کو اچک کر لے جاتی ہے۔ بالکل اُس چیل کی طرح جو پلک جھپکنے کی دیر میں مرغی کے چوزے کو دبوچ کر لے جاتی ہے۔"

"تم......ہمیں مارو گے؟ دو ٹکے کے انسان!" وہ ایک دم بھڑک کر بولا۔ "ہم تمہارے سارے خاندان کا نام و نشان مٹا دیں گے۔ ہم سلطان ارجمند غوری ہیں لوگ جس کا نام سن کر کانپنے لگتے ہیں۔ اُسے تم مارو گے؟"

"ہاں ماروں گا۔ اگر تم نے اپنی بکواس بند نہ کی تو ابھی ایک دھماکا ہوگا اور تمہارے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے کی کھوپڑی پاش پاش ہو جائے گی۔" اجنبی نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ چلایا۔ "اپنی ڈیمانڈ بتاؤ، ایک کروڑ دو کروڑ تین کروڑ یا پھر اس سے بھی زیادہ؟"

"گڈ یہ ہوئی نا بات۔" اجنبی نے قہقہہ لگایا۔ "تم نے اگر تعاون کیا تو یقیناً بچ جاؤ گے۔"

"پلیز اپنی ڈیمانڈ بتاؤ؟" اُس کی ساری اکڑ ایک پل میں ہوا ہو گئی اور وہ "ہم" سے "میں" پر آ گیا۔ "میں

ابھی پوری کردوں گا۔‘‘

اجنبی بولا۔’’میں تم سے فیس ٹو فیس بات کرنا چاہتا ہوں۔میری ڈیمانڈ کیا ہے؟ ابھی نہیں بتا سکتا۔ملاقات ہونے پر بتادوں گا۔‘‘

’’او کے مجھے منظور ہے بولو کہاں ملنا چاہتے ہو؟‘‘ اُس نے فوراً رضامند ہوتے ہوئے سوال کیا۔

’’ملاقات کا مقام میں تجھے طے کر کے بتادوں گا۔بس تم اتنا خیال رکھنا کہ اس بات کی بھنک بھی کسی کے کانوں میں نہ پڑے۔تم نے پولیس یا فیروز خان کو اس معاملے میں ملوث کیا تو بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔میرے آدمی تم پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔لہٰذا بھول کر بھی ایسی غلطی مت کرنا ورنہ پچھتاوے کے علاوہ کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔‘‘

اجنبی کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اُس پر عمل بھی کر گزرے گا۔ارجمند غوری کے کانوں میں پہلی بار خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔وہ جان گیا کہ اُس کا بیٹا اسی ٹارگٹ کلر کے ہاتھ چڑھ گیا ہے جس نے اُسے مارنے کی دھمکی دی تھی۔یہ صورت حال اُس کے لیے نہایت ہی خطرناک تھی۔تاہم وہ بولا۔’’تم بے فکر رہو میں کچھ بھی ایسا نہیں کروں گا جس سے میرے بیٹے کی جان خطرے میں پڑ جائے۔بس ایک ریکوئسٹ ہے کہ ملاقات کا وقت اور مقام جلد سے جلد طے کر کے مجھے بتادو؟‘‘

’’بتادوں گا۔میری اگلی کال کا انتظار کرنا۔‘‘ اجنبی نے جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

’’باسٹرڈ۔‘‘ غوری نے خود کلامی کے انداز میں اُسے ایک گالی دی اور پھر فیروز خان کا نمبر ملانے لگا کہ اب وہی اس معاملے میں اُس کی مدد کر سکتا تھا۔بڑے صاحب سے اُن دنوں ویسے بھی اُس کی اَن بن چل رہی تھی۔چنانچہ اُس سے مدد کی اپیل کرنا ایسا ہی تھا جیسے اپنا تھوکا ہوا چاٹنا۔

☆......☆......☆

رضوان نے غوری سے بات کرنے کے بعد سیل فون سے سم نکالی اور فون کو آف کر دیا۔سدو غور سے اُس کی حرکات نوٹ کر رہا تھا۔لہٰذا اُسے فون سے سم نکالتے دیکھ کر بولا۔’’آپ نے سیل فون سے سم کیوں نکالی ہے؟‘‘

’’تاکہ وہ نقلی سلطان ہمیں ٹریس نہ کر سکے۔‘‘ رضوان نے مسکرا کر جواب دیا۔

''وہ موبائل فون کے IM E نمبر سے بھی تو ٹریس کر سکتا ہے؟'' سدو نے سوال کیا۔

''سدو میاں! زیادہ دانش ور مت بنو.......IM E.I نمبر سے تو وہ تب ٹریس کرے گا نا! جب میں اس فون میں رجسٹرڈ سم ڈالوں گا؟''

''سوری رضوان بھائی! میں سمجھا شاید یہ بات..............''

''آپ کو معلوم نہیں ہوگی۔ یہی کہنا چاہتے تھے نا! تم؟'' رضوان نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

سدو نے جواب دینے کی بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔

رضوان بولا۔''سدو! یہ تو ایک عام سی بات ہے۔ جو آج سیل فون استعمال کرنے والا ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے۔''

''بس ایسے ہی منہ سے نکل گیا بھائی! اسی لیے تو سوری بولا ہے۔'' سدو نے نادم ہو کر جواب دیا۔

''چلو کوئی بات نہیں ہے میں ذرا باہر تک جا رہا ہوں، تم قیدی کا خیال رکھنا۔''

وہ بولا۔''بے فکر رہو رضوان بھائی! اُس کا تو باپ بھی یہاں سے نہیں نکل سکتا۔''

''او کے میں کچھ دیر تک واپس آ جاؤں گا۔'' جواب دیتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بڑے صاحب کے سامنے موجود تھا۔ ساری بات سننے کے بعد بڑے صاحب نے کہا۔''ارے بابا! اُڑا دے دونوں باپ بیٹے کو، کریم بھائی سے ہم خود ہی نمٹ لیں گے۔ پارٹی کے لیے اصل خطرہ یہی غوری ہے۔''

''تھینک یو سو مچ بڑے صاحب! آپ نے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اُتار دیا۔'' اب میں کھل کر کام کروں گا۔'' اُس نے ممنون انداز میں جواب دیا۔

''کوئی بات نہیں۔'' بڑے صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔''بس تم اتنا خیال رکھنا کہ دوبارہ ہمیں چھوڑ کر جانے کی مت سوچنا ورنہ اب کی بار ہمیں بہت تکلیف ہوگی۔''

''نہیں بڑے صاحب! اب ایسا نہیں ہوگا۔ شرافت کی زندگی تو آج کل شریفوں کو بھی راس نہیں آتی تو پھر میں ایسا کیوں کروں گا؟''

''گڈ...... تمہارے فیصلے سے ہمیں خوشی ہوئی ہے بابا۔ جاؤ اب جا کر اپنا ادھورا کام مکمل کرو۔ اس بار ہم تجھے خاص انعام دیں گے۔''

''وہ کیا بھلا بڑے صاحب؟'' اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔

بڑے صاحب نے قہقہہ لگایا۔ ''سرپرائز کو سرپرائز رہنے دو راجو بابا۔''

''ٹھیک ہے بڑے صاحب! میں تو آپ کا غلام ہوں۔ جیسے آپ کی خوشی۔''

''غلام نہیں راجو! ہم تجھے بیٹا سمجھتے ہیں۔ آئندہ ایسا کبھی مت کہنا ورنہ ہم ناراض ہو جائیں گے۔'' بڑے صاحب نے جواب دیا۔

''سوری بڑے صاحب! غلطی ہوگئی۔'' وہ قدرے شرمندہ ہو کر بولا۔ ''آئندہ خیال رکھوں گا۔''

''چلو کوئی بات نہیں۔'' بڑے صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کچھ چاہیے تو بولو؟''

''نہیں بڑے صاحب! ابھی تک تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ہوگی تو بلا جھجک مانگ لوں گا۔'' اُس نے جواب دیا اور پھر بڑے صاحب کو سلام کرتے ہوئے رخصت ہو گیا۔



ارجمند غوری نے رضوان کی ہدایت کے مطابق ساحلِ سمندر سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر گاڑی روک دی اور پیدل ساحلِ سمندر کی طرف چل دیا۔ سدو اور ارم بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ مگر وہ دونوں غوری کی نظروں سے اوجھل تھے۔ ویسے بھی وہ دونوں ایک بے فکرے جوڑے کی طرح گھوم رہے تھے۔ غوری تو کیا کوئی بھی اُن پر شک نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی کا پیچھا کر رہے ہیں۔ سڑک پر گاڑیوں کے علاوہ پیدل لوگ بھی آ، جا رہے تھے۔

لگ بھگ نصف گھنٹے کے بعد غوری درختوں کے ایک گھنے جھنڈ میں داخل ہو گیا۔ اُس نے چور نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر جیب سے سیل فون نکال لیا۔ وہ کسی کا نمبر ملانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ایک اجنبی نمبر سے اُسے کال آنے لگی۔ اُس نے بُرا سا منہ بنا کر کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے اُسی اجنبی کی تنبیہی آواز سنائی دی۔ ''غوری! میں نے کیا کہا تھا تجھے کہ چالاکی نہیں چلے گی۔ تم اب بھی میری نگاہوں میں ہو اگر تم نے فوراً سیل

فون جیب میں نہ ڈالا تو جواب میں گولی آئے گی۔‘‘

’’ابھی ڈالتا ہوں پلیز گولی مت چلانا۔‘‘

اُس نے بوکھلا کر کہا اور کال منقطع کیے بغیر سیل فون جیب میں رکھ لیا۔

موسم اگرچہ کافی حد تک خوش گوار تھا مگر غوری کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ وہ زندگی میں پہلی بار خود کو اس قدر بے بس اور خوف زدہ محسوس کر رہا تھا۔ ہر ظالم کی طرح وہ بھی فطرتاً بزدل ہی تھا۔ مناسب موقع تاڑ کر وہ فیروز خان کو اپنی لوکیشن بتانا چاہ رہا تھا۔ لیکن اجنبی دشمن اُس کی توقع سے کہیں زیادہ ہوشیار تھا۔ وہ نجانے کس طرح اُس پر نظر رکھے ہوئے تھا؟ غوری کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ تاہم دل ہی دل میں وہ اُس نادیدہ دشمن کو بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا۔ جس نے چند روز کے اندر ہی اُس کا سارا غرور خاک میں ملا دیا تھا۔ اور پھر یہ تو ابھی ابتدا تھی۔ اس کے بعد نہ جانے کیا کیا ہونے والا تھا؟ غوری قطعی بے خبر تھا۔

وہ انہی سوچوں میں غرق تھا کہ معاً اُس کے عقب میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ تیزی سے پلٹا تو اُس کے سامنے ایک نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ یہ سدو تھا۔ ارم کو اُس نے دوسرے رستے سے فلیٹ میں بھیج دیا تھا۔

’’ہیلو انکل! مجھے آپ کی رہنمائی کے لیے بھیجا گیا ہے۔‘‘ سدو نے خود پر جبر کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ’’آیئے میں آپ کو آپ کی منزل تک پہنچا دیتا ہوں۔‘‘

’’مم........ مجھے اپنے بیٹے سے ملنا ہے۔‘‘ وہ مضطرب ہو کر بولا۔ ’’وہ........ وہ کہاں ہے؟ میں........ میں اُس کے لیے........ اپنی ساری دولت دینے کے........‘‘

’’انکل! میں صرف ایک کارندہ ہوں۔‘‘ سدو نے قطع کلامی کی۔ ’’آپ کا بیٹا اُس کے پاس ہوگا جس نے آپ کو بلایا ہے۔‘‘

’’مجھے فوراً لے چلو اُس کے پاس۔‘‘

’’آیئے۔‘‘ سدو اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ ’’کوئی ہتھیار وغیرہ ہے تو ابھی سے میرے حوالے کر دو۔‘‘

’’کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس۔‘‘ وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے سدو کے ساتھ چل دیا۔

چند لمحوں کے بعد وہ ایک فلیٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ فلیٹ ایک الگ تھلگ مقام پر واقع تھا اور اس کے قرب و جوار میں کوئی دوسرا مکان نہیں تھا۔ ویسے بھی فلیٹ کو چاروں جانب سے گھنے درختوں نے گھیر رکھا تھا دُور سے وہ نظر بھی نہیں آتا تھا۔ غوری نے جونہی کمرے کے اندر پاؤں رکھا، اُسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ سامنے ہی صوفے پر محمود غزنوی پورے کروفر کے ساتھ تشریف فرما تھا۔ غوری کو اس بے چارگی کے عالم میں دیکھ کر بے اختیار اُس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ مگر افسوس کہ وہ بولنے سے قاصر تھا۔ غزنوی کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ جب کہ دوسرے صوفے پر ایک اجنبی نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔

''خوش آمدید.........خوش آمدید سلطانِ معظم۔'' نوجوان طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ''آیئے تشریف رکھیے۔''

''مم.........میرا بیٹا.........کہاں ہے؟'' اُس نے حیرت اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں سوال کیا۔

''سلطانِ معظم! آپ تشریف تو رکھیں بیٹا بھی مل جائے گا.........ابھی تو بہت سا حساب کتاب باقی ہے۔ پہلے وہ تو چکتا کر لیں؟'' نوجوان نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔

''جس.........جس قدر دولت چاہیے.........وہ میں دینے کے لیے.........'' معا سدو کی لات غوری کی پشت پر پڑی اور اُس کی بات نامکمل رہ گئی۔

''دولت کا لالچ کسی اور کو دینا۔'' سدو چلایا۔ ''تمہاری دولت کیا رضوان بھائی کا بیٹا واپس لا سکتی ہے؟ میرے باپ کو زبان دے سکتی ہے، اُس کے کٹے ہوئے ہاتھ دوبارہ جوڑ سکتی ہے؟ بولو جواب دو.........وہ جو تمہارے ظلم کا شکار ہو کر رزق خاک ہو چکے ہیں۔ تمہاری دولت کیا اُنہیں واپس لا سکتی ہے؟''

کمرا غوری کی کرب ناک چیخوں سے گونج اُٹھا۔ وہ گڑگڑا کر اُن سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ رو رہا تھا، چلا رہا تھا۔ گر گر کر اُٹھ رہا تھا اور اُٹھ اُٹھ کر گر رہا تھا۔ لیکن رضوان بہرہ بن کر تماشا دیکھتا رہا۔ جب کہ غزنوی تو ویسے بھی بولنے سے قاصر تھا۔ البتہ ارم قدرے پریشان نظر آ رہی تھی کیوں کہ سدو کا ایسا بھیانک روپ وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ رضوان نے اُسے اور محمود غزنوی کو باہر بھیج دیا۔ تاکہ وہ جلد لمحوں بعد پیش آنے والے دل خراش مناظر نہ دیکھ سکیں۔ غوری فرش پر گھسٹتے ہوئے رضوان کے قدموں تک پہنچ گیا۔ مگر سدو پر بدستور

جنون سوار تھا۔ معاً اُس نے جیب سے ایک تیز دھار اُسترا نکالا اور غوری کے سینے پر سوار ہو کر کسی بھیڑیے کے مانند غرایا۔ ''زبان باہر نکال کتے! ورنہ شہ رگ کاٹ دوں گا۔''

غوری نے گھسٹ کر اپنے ہاتھ رضوان کے پیروں پر رکھ دیے۔ رضوان نے ایک پل کے لیے سوچا اور پھر سدو سے بولا۔ ''ایک منٹ سدو! میں اسے ایک موقع دینا چاہتا ہوں۔ پلیز اسے چھوڑ دو۔''

''نہیں رضوان بھائی نہیں۔'' سدو پوری قوت سے چلایا۔ ''یہ معافی کے قابل نہیں ہے۔ آپ ہٹ جائیں درمیان سے۔ میں اپنا بدلہ لے کر رہوں گا۔''

رضوان نے کہا۔ ''میں نے کب کہا ہے کہ یہ معافی کے قابل ہے؟ میں تو اسے اس کی اوقات دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ جو خود کو ناقابلِ تسخیر سمجھتا ہے آج بلا لے اپنے حمایتیوں کو۔ دیکھتے ہیں کون آتا ہے اس کی مدد کو؟''

بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ لہٰذا سدو نے اُسے وقتی طور پر چھوڑ دیا۔ غوری کا چہرہ خون آلود تھا اور وہ ریس میں دوڑنے والے کتے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ رضوان نے ایک پُر تحقیر نظر اُس پر ڈالی اور بولا۔ ''غوری! بول کسے بلانا چاہتا ہے اپنی مدد کے لیے.........چل تجھے فون کرنے کی بھی اجازت ہے۔''

غوری نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے جیب سے سیل فون نکالا اور پھر ایک نمبر ملا دیا۔ جونہی رابطہ قائم ہوا وہ روتی ہوئی آواز میں گڑگڑایا۔ ''بڑے صاحب! م.........میں.........غوری.........ہوں.........پلیز.........م.........مجھے بچالو.........پپ.........پلیز.........بچالو.........یہ.........یہ لوگ.........مجھے مار ڈالیں گے.........مار ڈالیں گے.........پلیز.........پلیز.........''

''سوری رانگ نمبر بابا۔'' دوسری طرف سے رابطہ فوراً منقطع ہو گیا۔

''کیا ہوا غوری.........چھوڑ گیا نا! تیرا ان داتا تجھے، جس کی سپورٹ پر تجھے بڑا مان تھا؟'' رضوان نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''مم.........مجھ سے سودا کر لو.........مم.........میں اپنا سب کچھ تجھے دے دوں گا۔ بس مجھے اور میرے بیٹے کو جانے دو۔'' غوری نے امید بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

''غوری! میں ایک ٹارگٹ کلر ہوں۔ بدعہدی کرنا میرے پیشے کے خلاف ہے۔ میں بڑے صاحب سے

پہلے ہی تیری جان کا سودا کر چکا ہوں۔ وعدے سے سیاست دان پھرتے ہیں۔ ٹارگٹ کلر نہیں۔"

"پلیز......." غوری نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ "مجھ پر رحم کرو۔"

"تم نے کبھی کسی لاچار اور کم زور پر رحم کیا تھا؟......نہیں نا؟ تو پھر اب مجھ سے رحم کی توقع کیوں رکھتے ہو؟......البتہ تم کسی اور سے مدد مانگنا چاہو تو کال کر سکتے ہو۔"

غوری نے جلدی سے فیروز خان کو کال کی۔ "فیروز خان! میں سلطان غوری بول رہا ہوں۔ پلیز مجھے بچا لو.......پلیز.......جلدی سے آجاؤ، میں یہاں ساحلِ سمندر کے قریب ایک فلیٹ میں ہوں۔"

"میں کسی سلطان غوری کو نہیں جانتا۔ یہ تمہارا اور راجو کا معاملہ ہے۔" فیروز خان نے بے رخی سے جواب دیا۔

"تم.......تم نمک حرام ہو۔" غوری چلایا۔ "میں نے تم پر بے شمار احسان کیے ہیں اور............"

"وہ احسان تم نے اپنے فائدے کے لیے کیے تھے۔" فیروز خان نے قطع کلامی کی۔ "اور راجو میرا محسن ہے۔ اُس نے جان پر کھیل کر ایک بار میری جان بچائی تھی۔ میں اُس کے خلاف تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔"

"لعنت ہو تم پر۔" وہ ہذیانی انداز میں چلایا مگر فیروز خان نے ایک قہقہہ لگا کر رابطہ منقطع کر دیا۔

غوری نے جھنجھلا کر سیل فون پختہ دیوار پر دے مارا جو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فرش پر بکھر گیا۔

رضوان بولا۔ "دیکھ لیا غوری! بُرا وقت جب آتا ہے تو اپنے پرائے سبھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ آج کوئی بھی تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"پلیز.......تم ہی مجھ پر رحم کر لو۔" غوری پھر گڑگڑانے لگا۔

"اوں......ہوں۔" اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ "سلطان ہو کر رحم کی بھیک مانگنا تجھے زیب نہیں دیتا۔"

"پلیز.......پلیز......." غوری رونے لگا مگر رضوان نے سدو کو اشارہ کر دیا۔

دوسرے ہی پل سدو دوبارہ اُس کے سینے پر سوار ہو گیا اور پھر جب اُس نے غوری کا گلا پوری قوت سے دبایا تو چاروناچار غوری کو اپنی زبان باہر نکالنا ہی پڑی۔ پلک جھپکنے کی دیر میں سدو نے اُسترے والے ہاتھ کو حرکت دی تو غوری کی زبان کٹ کر دُور جا گری۔ وہ ذبح کیے ہوئے مرغ کی پھڑکنے لگا مگر سدو کے چہرے پر رحم کا شائبہ

تک نہیں تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سدو نے قسائیوں والا ٹوکہ اُٹھایا اور نہایت ہی بے رحمانہ انداز میں غوری کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے۔ غوری کی چیخیں دل دہلا رہی تھیں۔ مگر رضوان اور سدو بالکل بے پروا نظر آرہے تھے۔

چند لمحوں کے بعد رضوان نے جیب سے سائیلنسر لگا ریوالور نکالا اور یکے بعد دیگرے تین گولیاں اُس کے سینے میں اُتار دیں۔ غوری تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تو اُن دونوں نے اُسے اُٹھا کر دوسرے کمرے میں ڈال دیا جہاں اسفند غوری کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بعد کے واقعات نہایت ہی تیزی کے ساتھ وقوع پذیر ہوئے تھے۔ رضوان نے ارم اور محمود کو سدو کے ساتھ گھر بھجوا دیا۔ واپسی پہ سدو دو عدد بوریاں لانا نہیں بھولا تھا۔ دونوں نے مل کر لاشوں کو بوریوں میں بند کیا اور انہیں اُٹھا کر ٹیکسی کی عقبی سیٹ میں ٹھونس دیا۔ اس کے بعد اُنہوں نے فرش سے خون کے داغ صاف کیے اور پھر شام ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جونہی شام کا اندھیرا پھیلا وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر فلیٹ سے باہر نکل گئے۔ راستے میں ایک ویران سڑک کے کنارے اُنہوں نے ٹیکسی روکی اور دونوں بوریاں گھسیٹ کر باہر پھینک دیں۔

''خس کم جہاں پاک۔'' رضوان ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔

سدو بولا۔'' رضوان بھائی! میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں اُتار سکوں گا۔ اگر آپ تعاون نہ کرتے تو شاید میں کبھی بھی غوری جیسے طاقت ور لوگوں سے انتقام نہ لے سکتا میں عمر بھر آپ کا ممنون رہوں گا۔''

وہ بولا۔'' سدو! غوری میرے یا تیرے انتقام کا شکار نہیں ہوا بلکہ وہ مکافاتِ عمل کا نشانہ بنا ہے۔ کب کسی کے گناہوں کا گڑھا بھر جائے یہ صرف اُوپر والا جانتا ہے۔ اور جب اُوپر والا کسی ظالم کی دراز رسی کھینچتا ہے تو پھر اُسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔''

'' رضوان بھائی! آپ چھوڑ کیوں نہیں دیتے یہ خطرناک کام، جہاں پل پل موت کا خطرہ سر پہ منڈلاتا رہتا ہے؟'' سدو نے اچانک ہی ایک غیر متوقع سوال کر دیا۔

'' سدو! جرم کا رستا بند گلی کے مانند ہوتا ہے۔ جہاں سے نہ تو کوئی واپس پلٹ سکتا ہے اور نہ ہی اپنی منزل تک پہنچ پاتا ہے۔ میں نے ایک بار یہ رستا بڑے صاحب کی مہربانی سے چھوڑا تھا۔ مگر غوری جیسے لوگوں نے مجھے دوبارہ وہی رستا منتخب کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب دوسری بار بڑے صاحب مجھے کبھی بھی واپس اپنی دنیا میں جانے

نہیں دیں گے۔ میں نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ دوبارہ شریفوں کی دنیا میں نہیں جاؤں گا۔ میں اپنے عہد سے نہیں پھر سکتا۔“

سدو کے پاس اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ چنانچہ اُس نے موضوع ہی بدل دیا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن رضوان تھری پیس سوٹ میں ملبوس بڑے صاحب کے سامنے موجود تھا۔ بڑے صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ طاری تھی اور وہ قابلِ ستائش نظروں سے رضوان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”کمال کر دیا تم نے راجو بابا! کریم بھائی غوری کی موت کی خبر سن کر اب تو ہمارے تلوے چاٹنے پر بھی راضی ہے۔“

”یہ سب آپ کی مہربانی ہے بڑے صاحب! ورنہ یہ راجو تو ایک عام سا انسان ہے۔“ اُس نے سر جھکا کر مؤدب انداز میں جواب دیا۔

بڑے صاحب مسکرائے۔ ”بابا! ہمارے لیے تو تم خاص سے بھی کچھ بڑھ کر ہو۔ ہمیں جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوا تو تم نے چٹکیوں میں حل کر دیا۔“

”بڑے صاحب! یہ تو آپ کی محبت ہے۔ ورنہ دنیا کے لیے تو ہم جیسے ہمیشہ گندی نالی کے کیڑے ہی رہیں گے۔ جس متعفن سسٹم کی ہم لوگ پیداوار ہے اُس کے خلاف آج تک کوئی آواز اُٹھی ہے اور نہ اُٹھے گی۔ البتہ ہمیں ہمیشہ موردِ الزام ٹھہرایا جاتا رہے گا۔“

”یہ کیا راجو بابا!“ بڑے صاحب نے چونک کر پوچھا۔ ”لگتا ہے تم پر پھر شرافت کا بھوت سوار ہو رہا ہے؟“

”ایسی بات نہیں ہے بڑے صاحب!“ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”شریفوں کی دنیا میں ہم جیسوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں خوش ہوں اسی دنیا میں۔ آپ کوئی فکر نہ کریں۔ راجو اب کہیں جانے والا نہیں ہے۔“

”گڈ...... یہ ہوئی نا! بات۔“ بڑے صاحب نے قہقہہ لگایا پھر سنجیدہ ہو کر پوچھا۔ ”بیوی سے ملے ہو بابا؟“

”نہیں سیدھا آپ کے پاس ہی آیا ہوں۔“

”ٹھیک ہے تم بیوی سے جا کر ملو، اس کے بعد ہم تجھے وہ سرپرائز دیں گے۔ جس کا ہم نے تجھ سے وعدہ کیا

تھا۔" بڑے صاحب نے جواب دیا تو وہ سلام کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اُس کا رخ سرونٹ کوارٹرز کی طرف تھا۔ جہاں اُس کی بیوی نازنین ٹھہری ہوئی تھی۔ جب وہ کوارٹر کے اندر داخل ہوا تو نازنین اُسے دیکھ کر کھل اُٹھی۔ بہت دنوں کے بعد وہ نازنین کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ رہا تھا۔ اس لیے والہانہ انداز میں اُسے باہوں میں بھر لیا۔

"کیسی ہو میری جان؟" اُس نے نازنین کی پیشانی پر بوسہ ثبت کیا۔

"مجھے یہاں نہیں رہنا رضوان۔" وہ شکایتی انداز میں بولی۔ "پلیز........ مجھے اپنے گھر لے چلو....... یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔"

"اوکے بابا اوکے........ میں تجھے ابھی وہاں لے چلوں گا مگر اس سے پہلے مجھے ایک اچھی سی چائے پلا دو۔ بہت دن ہو گئے ہیں تیرے ہاتھ کی چائے نہیں پی۔" رضوان نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تم بیٹھو، میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔" وہ کچن کی طرف بڑھتے ہوئے بولی اور رضوان مسکرا دیا۔

لگ بھگ بیس منٹ کے بعد وہ دونوں بڑے صاحب کے سامنے موجود تھے۔ بڑے صاحب نے دونوں کی طرف باری باری دیکھا اور پھر رضوان سے کہا۔ "بابا! وعدے کے مطابق وہ سرپرائز حاضر ہے۔" یہ کہہ کر بڑے صاحب نے ٹیبل سے ایک خاکی رنگ کا لفافہ اور دو عدد رنگز اُٹھا کر رضوان کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ کیا ہے بڑے صاحب؟" اُس نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"بابا! ہم نے تمہارے لیے ایک چھوٹا سا بنگلا اور ایک گاڑی خریدی ہے۔ شان دار پراڈو بالکل زیرو میٹر، جب کہ اس لفافے میں اُس بنگلے کے مالکانہ کاغذات ہیں۔ بنگلا اور گاڑی دونوں تمہارے نام پہ رجسٹرڈ ہیں۔ جاؤ عیش کرو۔" بڑے صاحب نے ہنس کر جواب دیا۔

وہ بولا۔ "بڑے صاحب! اس کی کیا ضرورت تھی؟ میرے پاس گھر بھی ہے اور موٹر بائیک بھی۔"

بڑے صاحب نے نازنین کی طرف دیکھا اور شفقت سے بولے۔ "راجو بابا! یہ ہم نے اپنی بہو کو تحفہ دیا ہے۔ لہٰذا تجھے اس پر کوئی اعتراض کرنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"بڑے صاحب! آپ بھی نا! بس کمال کرتے ہیں۔"

”بھئی! کبھی کبھی انسان کو کمال کرنا چاہیے۔“ بڑے صاحب نے قہقہہ لگایا۔ ”کیوں نازنین! ہم نے کچھ غلط تو نہیں کہا ہے؟“

”جی نہیں بڑے صاحب! آپ نے بالکل درست فرمایا ہے۔“ نازنین نے قدرے شرما کر جواب دیا۔

”لو بھئی راجو! اب فیصلہ ہو گیا بابا۔ جاؤ دونوں عیش کرو۔“

وہ دونوں بڑے صاحب کو سلام کرتے ہوئے خوشی خوشی باہر نکل گئے۔ جب کہ بڑے صاحب اُٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں پہنچ گئے۔ وہیں وہ اخبارات بھی پڑھا کرتے تھے اور ٹی وی پر نیوز وغیرہ بھی سنتے رہتے تھے۔

لاؤنج میں جاتے ہی بڑے صاحب نے ایک اخبار اُٹھا لیا، جس کے فرنٹ پیج پر غوری اور اُس کے بیٹے کی ہلاکت کے بارے میں تفصیلی خبر لگی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے خوشی کے عالم میں پوری خبر پڑھ ڈالی۔ حالانکہ اس سے قبل وہ صرف خبر کی ہیڈنگ پڑھا کرتے تھے۔ اُنہوں نے چند دیگر سُرخیوں پر سرسری سی نظر ڈالی اور پھر دوسرا اخبار اُٹھا لیا۔ وہاں بھی غوری والی خبر فرنٹ پیج پہ چھپی تھی۔ چنانچہ یہ خبر بھی اُنہوں نے تفصیل سے پڑھنی شروع کر دی۔ دونوں اخبارات میں خبر کی تفصیل تقریباً ایک جیسی ہی تھی۔ اسی اثناء میں ایک ملازم کافی لیے لاؤنج میں پہنچ گیا۔ ملازم نے کافی کا کپ اُن کے سامنے ٹیبل پر رکھا اور خاموشی سے واپس لوٹ گیا۔ ملازم کے جاتے ہی بڑے صاحب نے کپ اُٹھا کر کافی کی ایک چسکی ہی لی تھی کہ معاً اُن کا سیل فون بجنے لگا۔ اُنہوں نے سکرین پر نظر ڈالی تو فوراً محتاط ہو گئے۔ کال ایک اہم نمبر سے آ رہی تھی۔

”ہیلو سر! جے کے اسپیکنگ۔“ اُنہوں نے مؤدب انداز میں کال ریسیو کی۔

”مسٹر جے کے! ٹی وی آن کرو اور............ نیوز چینل دیکھو۔“ دوسری جانب سے بولنے والے نے ایک معروف چینل کا نام لیا۔

بڑے صاحب نے فوراً ٹی وی آن کیا اور مطلوبہ چینل لگا دیا۔ روڈ کے بیچ ایک پراڈو گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ جس کی ونڈ سکرین گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھی اور اندر ایک مرد اور ایک عورت خون میں لت پت پڑے ہوئے تھے۔ بڑے صاحب کو اُنہیں پہچاننے میں ایک سیکنڈ کی دیر بھی نہیں لگی۔ وہ راجو اور نازنین تھے۔ نیوز چینل کا نمائندہ پورے جوش وخروش کے ساتھ واقعے کی تفصیل بیان کر رہا تھا۔ مگر بڑے صاحب کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا

تھا۔ سیل فون بدستور اُن کے کان سے لگا ہوا تھا۔ چنانچہ بدقت تمام اُنہوں نے پوچھا۔ ''یہ.......... یہ سب .... کیسے ہوا........ اور کس نے کیا.......... یہ تو ہمارا خاص آدمی تھا؟''

''جے کے! کیا تم نہیں جانتے کہ ہماری دنیا میں خاص اور عام کوئی نہیں ہوتا؟'' بولنے والے کے انداز میں سرزنش تھی۔ ''تمہیں پتا ہے آج کل ڈیفنس فورسز نے شہر میں آپریشن شروع کر رکھا ہے۔ جلد یا بدیر اس نے پکڑے ہی جانا تھا۔ ہم نے وہی کیا جو اُوپر سے آرڈر ملے تھے۔''

''پھر بھی یہ اچھا نہیں ہوا۔ وہ ہمیں بہت زیادہ عزیز تھا۔'' بڑے صاحب نے رنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''جے کے! ہوش میں آؤ ہماری دنیا میں جذبات کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ ہم صرف شطرنج کے مہرے ہیں۔ جنہیں بساط پہ بچھانے والے ہاتھ ہمیشہ پوشیدہ رہتے ہیں۔ کل ہماری یا تمہاری باری بھی لگ سکتی ہے۔ او کے گڈ بائے۔'' دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

بڑے صاحب چند لمحے تو گم صم بیٹھے رہے اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کی آنکھیں بھیگتی چلی گئیں۔

